قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۶ شمارہ: ۱۲
ذوالحجہ: ۱۴۴۴ھ - جولائی: ۲۰۲۳ء
قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِسالانہ: ۶۵۰ روپے

مُدیر/مُدیر مسئول
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر
مولانا سید احمد یوسف بنوری

مُدیر مُعاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ ’’بینات‘‘ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ’’بینات‘‘: 021-34927233

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک
یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر
عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر
اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

وضاحت

ماہنامہ ’’بینات‘‘ میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: + 92-21-34919531
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk
ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

حج: عشقِ حقیقی کا مظہر اور انسانیت کی بقا کا ضامن!	۳	سید سلیمان یوسف بنوری

مقالات و مضامین

مکاتیب حضرت وصل بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ	۱۱	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
رائے، اہلِ رائے اور فقہائے احناف!	۱۷	مفتی عبید الرحمٰن
محرم الحرام اور یومِ عاشوراء ... فضائل اور تاریخ	۲۵	مولانا عبد القوی ذکی حسامی
راستوں کی نظافت و صفائی کی اہمیت ... تعلیماتِ نبوی	۳۱	مولانا عصمت اللہ نظامانی
مسئلہ تقدیر اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ایمان افروز خط	۳۴	مولوی محمد نعمان خلیل
زمزم ... فضیلت، اہمیت اور فوائد	۴۱	مولوی عظیم اللہ
حضرت مولانا عبد الرؤف ہالیجویؒ ... اوصاف و ملفوظات	۴۸	مولوی نظام الدین

یادِ رفتگاں

حضرت مولانا حسن الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ	۵۲	قاری تنویر احمد شریفی

دار الافتاء

سی جی ایم شوگر کنٹرول سینسر لگے ہونے کی حالت میں وضو، غسل اور نماز کا حکم	۵۹	ادارہ

نقد و نظر

عباد الرحمٰن ... علم اور اہلِ علم ... زیارتِ روضۂ اقدس علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام	۶۲	ادارہ

حج: عشقِ حقیقی کا مظہر اور انسانیت کی بقا کا ضامن!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله وسلامٌ علٰی عباده الذین اصطفٰی

عاشقوں کے قافلے دیارِ محبوب کی طرف رواں دواں ہیں، جوں جوں ایامِ وصل قریب آ رہے ہیں‘ اضطراب بڑھ رہا ہے اور دھڑکنیں تیز ہو رہی ہیں۔ دنیا کے ہر خطے، رنگ و نسل اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اہلِ ایمان‘ نداءِ ابراہیمی پر لبیک کہتے ہوئے مرکزِ وحدت کی طرف والہانہ دوڑ رہے ہیں، کچھ پیدل ہیں تو کچھ لاغر سواریوں پر، کوئی براستہ سمندر پہنچنے کی سعی میں ہے تو کوئی بذریعہ ہوائی جہاز، کسی نے پیٹ کاٹ کر آنہ آنہ جمع کر کے رختِ سفر کا انتظام کیا ہے تو کسی نے خون پسینہ بہا کر مطلوب تک پہنچنے کا تہیہ کر رکھا ہے، دل بیت اللہ اور شعائر اللہ کی تعظیم سے لب ریز ہیں تو زبانوں پر ’’لبيك اللّٰهم لبيك‘‘ کی صدائیں ہیں۔ معمارِ کعبہ‘ ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر تا حال اس گھر اور اس سے متعلقہ اشیاء اور کرداروں میں عشق کی خوشبو ایسی بسی ہے کہ دیگر عناصر پر غالب محسوس ہوتی ہے۔

آزر کے گھر توحید کے علم بردار کو پیدا کر کے حق تعالیٰ شانہ نے اس کے دل میں اپنا ایسا عشق بسایا کہ زندگی کے جس موڑ پر جو حکم دیا آنکھ بند کر کے اس پر سرِ تسلیم خم کیا اور دل کی توجہ لمحے بھر کے لیے بھی کسی دوسری جانب نہ گئی، بے آب و گیاہ صحرا میں لختِ جگر اور رفیقِ حیات کو تنہا چھوڑنا ہو یا جوانی کی

دہلیز پر قدم رکھتے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنا، ترکِ وطن اور طویل اسفار ہوں یا سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان مادی اسباب کے بغیر اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان گھر کی تعمیر، بادشاہِ وقت سے مناظرے ہوں یا وقت کے طاغوت کی بھڑکائی ہوئی محیر العقول آگ میں جانا، عقلِ انسانی اس کے پیمانۂ عشق کا اندازہ لگانے سے عاجز ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس عاشقِ صادق سے بیت اللہ کی تعمیر کرواکر حکم دیا گیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرے، یہ حکم بجائے خود عشق وعقل کا امتحان تھا، موقع پر نہ تو انسانوں کا مجمع تھا نہ ذرائعِ مواصلات، لیکن جب حکمِ اَذان ہوا تو اللہ کے خلیل نے فوراً تعمیل کی، اس پاکیزہ و پُرخلوص پکار کی تاثیر کچھ ایسی تھی کہ تاحال عشاق اس کی طرف وارفتہ دوڑ رہے ہیں، اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

الغرض بیت اللہ کے گوشے گوشے اور اِردگرد کے علاقے میں اس پاکیزہ گھرانے کے جذبۂ عشق کی یادگاریں رکھ دی گئی ہیں، مقامِ ابراہیم ہو یا صفا ومروہ کے درمیان سعی، جمرات کی رمی ہو یا اس کے قریب مذبحِ اسماعیل، عرفات کا میدان ہو یا منیٰ کی وادی، سب اس عاشق گھرانے کے جذبۂ عشق کی ایسی یادگاریں ہیں جنہیں دیکھنا بھی عبادت قرار دے دیا گیا۔

حج کی عبادت' عشقِ الٰہی کی اِن یادگاروں سے جڑی ایک عاشقانہ عبادت ہے، دینِ اسلام دینِ فطرت ہے، اس نے فطرت کے ہر تقاضے کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے کا سامان بہم پہنچایا ہے، انسانی سرشت میں عشق ومحبت کا جذبہ بھی رکھا گیا ہے، اگر اسے خالقِ انسانیت کی مرضیات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فانی دنیا میں لگا دیا جائے تو یہ ناجائز عشق ٹھہرتا ہے، اور یہی جذبہ جب اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے حکم کی اتباع میں ہو تو عشقِ حقیقی اور باعثِ ثواب ٹھہرتا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ'' (البقرۃ:۱۶۵)

ترجمہ: ''اور جو مؤمن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔''

(بیان القرآن: ۱/ ۱۱۵، ط: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

بیت اللہ سے محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہی تقاضا ہے، کامل مسلمان وہ ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اور دین کی یادگاروں کی تعظیم اور محبت ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ'' (الحج:۳۲)

ترجمہ: ’’اور سن لو کہ جو شخص دینِ خداوندی کی ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا، تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔‘‘

(بیان القرآن: ۲/ ۵۲۰، ط: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

اصل مطلوب تو اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، یہ درو دیوار اور حجر و مقام مطلوبِ اصلی نہیں، لیکن ہم انسان فانی، ناقص اور محدود ہیں، اپنے جذبات کے اظہار میں محسوسات کے محتاج ہیں، انسان کو کسی سے عشق ہو تو وہ چاہتا ہے اسے دیکھے، اس کے پاس جائے، اس سے گفتگو کرے، اس کے درو دیوار کو چومے، اس کے گھر کے چکر لگائے، کوچہ و بازار گھومے، اور وصل نصیب ہو جائے تو اس سے لپٹ کر روئے، اس کے قدم اور ہاتھ چومے:

أمرّ على الديارِ ديارِ ليلى أقبّل ذا الجدار و ذا الجدار

و ما حبّ الديار شغفن قلبي و لٰكن حبّ من سكن الديار

انسان کو جب اللہ تعالیٰ سے محبت کا حکم دیا گیا تو انسانی فطرت کا تقاضا تھا کہ اسے عشقِ خداوندی کی کچھ یادگاریں بھی دی جاتیں، جن کی طرف سفر کر کے، ان کے چکر لگا کر، وہاں کے درو دیوار کو چوم کر، ان سے لپٹ کر اپنے جذبۂ عشق کی تسکین کرتا، اور ان مقاصد کے حصول کے دوران سچے عاشق کی طرح، شاہانہ طمطراق اور رئیسانہ وضع کو ترک کرتا، سفر کی مشقتیں برداشت کر کے پراگندہ ہیئت محبوب کے در پر جا پہنچتا کہ اس کی قربانیاں دیکھ کر محبوب کو رحم آ جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کیفیات کے حصول اور محبت کے جذبات کی تسکین کے لیے حج کی عاشقانہ عبادت اور بیت اللہ اور اس کے اِردگرد عشقِ الٰہی کی یہ یادگاریں مقرر فرما دیں۔

دُور اُفتادہ علاقوں سے بیت اللہ تک سفر، فاخرانہ لباس چھوڑ کر دو چادریں زیبِ تن کرنا، خوشبو کے استعمال سے گریز، میلا کچیلا بدن، پراگندہ حالت، بال ناخن نہ کاٹنا، سخت سردی و گرمی کے باوجود سر نہ ڈھانپنا، اپنی سپردگی کا اظہار بآوازِ بلند تلبیہ کی صداؤں سے کرنا، دیارِ محبوب میں دیوانہ وار چکر لگانا، کبھی دوڑنا، کبھی سر بسجود ہو کر محبوب کو منانے کی کوشش کرنا، کبھی منیٰ کی وادی میں پڑاؤ ڈالنا تو کبھی سخت گرمی میں عرفہ کے میدان میں محبوب کی معرفت کی راہیں تلاش کرنا، مزدلفہ میں سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات گزارنا اور محبوب کے دشمن کو کنکریاں مارنا یہ سب عاشقانہ ادائیں ہی تو ہیں، یوں تسکین نہیں ہوتی تو بالآخر اپنی جان کی قربانی کے جذبے سے سرشار ہو کر جانور کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے، سر کے بال منڈوا کر دوبارہ محبوب کے گھر پہنچ کر چکر لگانا شروع کرتا ہے، درِ محبوب سے جا چمٹتا ہے، بابِ کعبہ پر گریہ و

زاری کرتا ہے، حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے اور ملتزم سے سینہ چمٹا کر بلک بلک کر روتا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ اُسے محبوب کی دست بوسی وقدم بوسی کی لذت ولطف عطا فرماتا ہے۔ الغرض حاجی اس پاکیزہ سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی بے خودی کے عالم میں محو ہوجاتا ہے، پھر اپنی ذات اور شان کی فکر سے بھی اسے کراہت محسوس ہوتی ہے، درویش ہو یا بادشاہ، وقت کا ولی ہو یا گناہ گار، اس مقام پر جتنی فنائیت بڑھتی ہے اتنا قرب بڑھتا جاتا ہے۔

عشق کا پہلا درس: فنائیت اور اطاعتِ کامل

حج کی پوری عبادت میں قدم قدم پر عقل کے بت توڑے گئے ہیں، فنائیت اور اطاعتِ کامل کا درس دیا گیا ہے، یہ سکھایا گیا کہ عاشقِ صادق وہی ہوتا ہے جو محبوب کی چاہت اور اشارۂ ابرو پر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہے، خواہ اس کا حکم سمجھ میں آئے یا نہیں۔ حرم شریف میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر قرار دیا گیا ہے، لیکن جب اسے حکم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کو چھوڑ کر میدانِ عرفات میں نمازیں ادا کرنی ہیں تو سخت گرمی میں وہاں پہنچ جاتا ہے، جہاں سال کے بقیہ ۳۵۳ دنوں میں کوئی عبادت انجام نہیں دی جاتی۔ شیطان جو نظر نہیں آتا اسے چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے مارنے کا حکم دیا گیا، اسی میں شیطان کے لیے شدید تکلیف اور رسوائی ہے۔ منیٰ میں قربانی کا خون بہانے میں بظاہر حاجی کا فائدہ نہیں ہے، لیکن افضل حج اسے قرار دیا گیا جس میں قربانی بھی ہو، اور جتنی زیادہ ہو اتنی فضیلت ہے۔ عقل کے پیمانے پر یہ احکام نہیں اُترتے، ہاں! عشق کے پیمانے پر پورے اُترتے ہیں کہ اسلام نام ہی سرِ تسلیم خم کرنے کا ہے:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

عشق کا دوسرا درس: قربانی اور اس کی حقیقت

حج میں دوسرا اہم پہلو قربانی ہے، پورے سفر میں قدم قدم پر قربانیاں ہیں، کہیں مال کی قربانی، کہیں خواہش کی قربانی، کہیں نفس اور اَنا کی قربانی، رفقاءِ سفر کی خاطر اپنی رائے اور راحت کی قربانی، اور انجامِ کار ''یوم النحر'' میں اپنی جان قربان کرنے کے جذبے کے پیشِ نظر جانور کی قربانی! قربانی حج کی ہو یا عید الاضحیٰ کی، اس میں جذبۂ ایثار اور سپردگی کے کمال کی تربیت دی گئی ہے۔ جانور کی قربانی درحقیقت انسانی جان کی قربانی کا بدل ہے، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی قربانی قبول فرماکر جانور کی قربانی کو اس کا بدل قرار دے دیا:

’’وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ‘‘ (الصّٰفّٰت:۱۰۷)

ترجمہ:’’اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا۔‘‘(بیان القرآن:۳/۲۵۸،ط:مکتبہ رحمانیہ،لاہور)

لہٰذا قربانی کی رُوح اور حقیقت جان نثاری وجاں سپاری کا جذبہ ہے، انسان ہر وقت یہ سوچے کہ یہ جان اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، مجھے ہر وقت اس کی قربانی کے لیے تیار رہنا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ اس نے اپنی رحمت سے اسے جانور کی قربانی سے تبدیل فرمادیا، اسی جذبے کی تجدید کے لیے اللہ تعالیٰ نے سنتِ ابراہیمی کو ہمارے لیے سالانہ عبادت قرار دے دیا۔

جذبۂ عشق کا نتیجہ

حج کی عبادت میں جذبۂ عشق وفنائیت اور ایثار وقربانی کا نتیجہ عالم گیر اتحاد ویگانگت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، پوری دنیا سے مختلف طبقات اور رنگ ونسل کے لوگ اپنے درمیان فرق مٹا کر جمع ہوتے ہیں، بادشاہ ہو یا فقیر، گناہ گار ہو یا اللہ کا ولی، ہر ایک کا لباس یکساں ہے، ہر ایک نے میدانوں، وادیوں اور اللہ کے گھر کے چکر لگانے ہیں، اس کی برکت سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے برداشت اور احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، بسا اوقات عفو ودرگزر کے وہ مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ کہیں اور ان کا تصور بھی مشکل ہوتا ہے، یہ اسی جذبۂ عشق ومحبت وفنائیت کے نتائج ہیں۔ دوسروں کو معاف کرنے اور تواضع اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ نے عجیب تاثیر رکھی ہے، بندہ خدا کی خاطر جتنا جھکتا ہے، اتنا ہی بلند ہوتا جاتا ہے، صحیح مسلم میں ہے:

’’ما زاد الله عبدًا بعفو إلا عزًّا، و ما تواضع أحد لله إلا رفعه الله.‘‘

یعنی’’اللہ تعالیٰ دوسروں کو معاف کرنے کے نتیجے میں بندے کی عزت ہی بڑھاتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرے اللہ تعالیٰ اسے ضرور بلند فرماتے ہیں۔‘‘

یہ حقیقت ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے خود کو فنا کردیتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ بقا عطا فرمادیتے ہیں:

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

’’بیت اللہ‘‘ انسانیت کی بقا کا ضامن

فنائیت کی تہ میں انسانیت کی بقا کے راز کا درس‘ سالانہ بنیاد پر اُس گھر میں جمع کرکے دیا جاتا ہے، جس کے مبارک وجود میں انسانیت کی بقا اور اس کا قیام مضمر رکھا گیا ہے، قرآنِ مجید میں ہے:

’’جَعَلَ اللهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ ‘‘ (المائدۃ:۹۷)

ترجمہ: ’’اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے لیے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا۔‘‘ (بیان القرآن: ۱/ ۵۱۷، ط: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

یعنی یہ گھر انسانوں اور ان کے دینی و دنیاوی منافع کی بقا اور قیام کا ذریعہ ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے:

’’إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ‘‘ (آل عمران:۹۶)

ترجمہ: ’’یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو مکہ میں ہے، جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں بھر کے لوگوں کا راہنما ہے۔‘‘

(بیان القرآن: ۱/ ۲۶۲، ط: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

یعنی انسانوں کی ہدایت کے لیے سب سے پہلے یہ بابرکت گھر بنایا گیا، جب کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق کے وقت سب سے پہلے وجود میں آنے والا حصہ یہی بقعۂ مبارکہ ہے، پھر انسان کے دنیا میں بسنے سے پہلے ہی فرشتوں کے ذریعے اس گھر کی تعمیر اور بنیاد رکھوائی گئی، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء کرام علیہم السلام کو اس کے حج اور اس کی طرف رخ کر کے عبادت کا حکم دیا گیا، انسانیت کی ابتدا سے تا قیامت انسانوں کی روحانی ضروریات کا سامان بھی یہاں سے ہوتا رہے گا اور دنیاوی ضروریات کا بھی، فرمانِ خداوندی ہے:

’’أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰى إِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ‘‘ (القصص:۵۷)

ترجمہ: ’’کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس (یعنی ہماری قدرت اور خدائی) سے کھانے کو ملتے ہیں، لیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے۔‘‘ (بیان القرآن: ۳/ ۹۶، ط: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ‘‘ (البقرۃ:۱۲۵)

ترجمہ: ’’اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے) مقرر رکھا۔‘‘

چناں چہ اس گھر میں ایسی مقناطیسی کشش رکھ دی گئی ہے کہ پورا سال تسلسل کے ساتھ اطرافِ

عالم کے لوگ، دنیا جہاں کا کاروبار اور ہر نوع کی مصنوعات اس کی طرف کھچی چلی آتی ہیں، بالخصوص اشہرِ حُرم کی اِن پاکیزہ ساعتوں میں یہ مقام منتخب قدسی نفوس کی جلوہ گاہ ہوتا ہے، ان کی برکت سے اُمت کی مغفرت کے فیصلے ہوتے ہیں، اور خدائے دوجہاں کی رحمتیں متوجہ ہوتی ہیں، اس گھر کی یہ رونقیں اور ذکراللہ کی یہ فضا روئے زمین کی بقا کی ضامن ہیں۔ احادیثِ مبارکہ میں بیت اللہ کی تخریب و ویرانی کو قیامت کی آخری علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، گویا بیت اللہ کی بقا ذکراللہ کی بقا کا ذریعہ اور ذکراللہ انسانیت کی بقا کا ذریعہ ہے:

دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

حج کا پیغام اُمتِ مسلمہ کے نام

ہر سال عشق و محبت کے پروانوں کا بیت اللہ میں اجتماع رکھ کر جہاں انہیں اپنی بقا و قیام کے ذریعے سے جوڑا جاتا ہے، وہیں حج کے اس عظیم الشان عالم گیر اجتماع میں اُمتِ مسلمہ کی عشق وفنائیت اور ایثار وقربانی کے پہلو سے تربیت کی جاتی ہے کہ جیسے حاجی عشقِ حقیقی کے جذبے میں خود کو فنا کردیتا ہے، اور حج میں قدم قدم پر ایک دوسرے کے لیے ایثار اور قربانی دلوائی جاتی ہے، اسی طرح پوری اُمتِ مسلمہ اگر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے عشقِ حقیقی میں ڈوب کر خود کو فنا کردے، ہر وقت دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ایثار وقربانی کا جذبہ بیدار رہے، دوسروں کے ساتھ تواضع کا برتاؤ ہو، مختلف طبقات کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنر پیدا ہو، رفقاء وشرکاء کی رائے سننے، سمجھنے اور ضرورت ہو تو قبول کرنے کا ملکہ پیدا ہو، تو آپس کی رنجشیں اور مشکلات ختم ہوجائیں اور زندگی کے مراحل آسان ہوجائیں، دنیا کی ترقیات بھی ہوں، اور روحانیت کے مدارج بھی طے ہوں، کیا ہی اچھا ہو کہ مسلمانانِ عالم حج کی عبادت سے یہ دروسِ عبرت حاصل کریں، اور انفرادی واجتماعی زندگی کو ان خطوط پر استوار کرلیں۔

خصوصاً ہمارا ملک اِس وقت جن مخاصمات ومجادلات اور داخلی انتشار سے گزر رہا ہے، حج کی عبادت ان دونوں پہلوؤں سے ہمیں متوجہ کررہی ہے کہ تمام سیاسی و مذہبی جماعتیں اور مختلف فریق ملک و ملت کے مفاد میں ایک درست مقصد پر جمع ہوجائیں، اپنی اَنا، شہرت، رائے اور مفادات کی قربانی دیں، دوسروں کے ساتھ چلنے اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا ظرف پیدا کریں، جہاں حق کے لیے جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے، وہاں کم از کم اپنی رائے اور ذاتی یا وقتی مفادات کی قربانی کوئی

بڑی چیز نہیں ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اسی میں ملک وملت کا مفاد ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اس میں ملک کی ترقی واستحکام بھی مضمر ہے۔

اپنی معروضات اس پر تاثیر دعا پر ختم کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام میں مانگی تھی اور حجاجِ کرام میدانِ عرفہ میں اس میں مشغول ہوں گے:

’’اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَ تَرٰى مَكَانِيْ وَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَ عَلَانِيَتِيْ لَايَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ اَمْرِيْ وَ اَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهٖ، اَسْأَلُكَ مَسْاَلَـةَ الْمِسْكِيْنِ و اَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَ اَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ وَ دُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَـتُهٗ وَ فَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَ ذَلَّ جَسَدُهٗ وَ رَغِمَ لَكَ اَنْفُهٗ ، اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْنِيْ بِدُعائِكَ شَقِيًّا وَّ كُنْ بِيْ رَؤُوْفًا رَّحِيْمًا يَّا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ!‘‘

ترجمہ: ’’اے اللہ! تو میری بات سنتا ہے اور میں جہاں جس حال میں ہوں تو اس کو دیکھتا ہے، اور میرے ظاہر و باطن سے تو باخبر ہے، تجھ سے میری کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں، میں دکھی ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقراری ہوں، تجھ سے سوال کرتا ہوں، جیسے کوئی عاجز مسکین بندہ سوال کرتا ہے، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں، جیسے گناہ گار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے دعا کرتا ہوں، جیسے کوئی خوف زدہ آفت رسیدہ دعا کرتا ہے، اور اس بندے کی طرح مانگتا ہوں جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ! تو مجھے اس دعا مانگنے میں ناکام ونامراد نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان اور رحیم ہوجا، اے ان سب سے بہتر وبرتر جن سے مانگنے والے مانگتے ہیں اور جو مانگنے والوں کو دیتے ہیں!۔‘‘

وصلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

مکاتیب حضرت وصل بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ [1]

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خانقاہِ امدادیہ، تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر

۱۴ ستمبر سنہ ۴۰ء

مولانا المکرم، ذي المجد والکرم، أکرمکم الله تعالیٰ !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جناب کا مکرمت صحیفہ مجھے ۹ ستمبر کو مل گیا، مگر اِدھر برابر علیل رہا، اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، معافی کا طالب ہوں۔ دوسرے اِدھر دو روز جناب مولوی محمد طیب صاحب (سابق مہتمم دار العلوم دیو بند) کی تشریف آوری نے اور مصروف رکھا، بہرحال عذر خواہ ہوں، اور آپ سے خواستگارِ معافی!

آپ نے جن الفاظ میں مجھے یاد فرمایا ہے، ان کے لیے جس قدر میں فخر کروں' کم ہے۔ یہ میری سعادت، یہ میری خوش بختی، اور میرے لیے باعثِ افتخار ہے کہ آپ کا ایسا عالم، فاضل، متقی، محقق

---

[1] - وصل بلگرامی مرحوم، بلگرام (ضلع ہردوئی، یوپی، انڈیا) کی مردم خیز سرزمین کے باسی اور اردو کے نامور شاعر اور ادیب گزرے تھے، اردو، فارسی اور کسی قدر عربی اور انگریزی سے واقف تھے۔ انہوں نے پہلے پہل ''عالمگیر'' نامی رسالہ جاری کیا اور بعد میں چند برس تک لکھنو سے ''مرقع'' نامی ایک ادبی رسالہ بھی شائع کرتے رہے۔ جوانی میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ سے متعلق ہوگئے تھے، اور زندگی کے آخری دس بارہ برس سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے ارادت کا تعلق رہا، اس عرصے میں وہ زیادہ تر تھانہ بھون ہی میں خانقاہ امدادیہ کے ایک حجرہ میں مقیم رہے۔ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۶۱ء کو اسی حجرہ میں وفات پائی، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور تھانہ بھون کے قبرستان میں ہی تدفین ہوئی۔ (ملاحظہ فرمایئے: یادِ رفتگاں، سید سلیمان ندوی، ص: ۲۳۹-۲۴۰، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی)

اور صاحبِ دل بزرگ مجھے اس طرح نوازے۔ خدائے برتر وتوانا کاش اس ناکارہ اور اس گنہگار کو اپنا بنالیں اور بس!

میں نے آپ کا گرامی نامہ بھی حضرت اقدس (مولانا اشرف علی تھانوی صاحب) مدظلہم العالی کے حضور میں پیش کر دیا تھا، لفظ بلفظ پڑھا، دعائیں دیں، اور فرمایا: ''میرے پاس بھی خط آیا ہے، بڑی محبت سے یاد کیا ہے، میں نے بھی اسی طرح کا جواب دیا ہے۔'' اور پھر دعائیں زبان مبارک سے نکلیں، خدا کرے مبارک ہوں، اور مقبول ہوں۔

میں تو اُن ساعتوں اور مبارک ومسعود ساعتوں کا متمنی ہوں، جب آپ کی گرامی صحبت مجھے حاصل ہو، وہ لمحات میری زندگی میں یادگار رہوں گے، اور وہ وقت میرے لیے نہ معلوم کس قدر سازگار ہوگا، ان شاء اللہ! میرا ارادہ رمضان شریف ''لکھنؤ'' میں کرنے کا ہے۔ ہاں! اگر مجھے آپ کا پروگرام معلوم ہو جائے تو میں پوری کوشش کروں گا کہ جب آپ تھانہ بھون آئیں، میں بھی آسکوں، ان شاء اللہ!

میں آپ کی بزرگانہ محبت، نوازش، توجہ اور کرم گستری کو کبھی نہیں بھول سکتا، کاش! یہ ساعتیں ہمیشہ نصیب رہیں۔

اُمید ہے کہ آپ اپنی اور متعلقین کی خیریت سے ممتاز فرماتے رہیں گے، اور جب کوئی خدمت میرے لائق ہوگی، سرفراز فرمائیں گے۔

حضرت مولانا (بظاہر حکیم الامت رحمہ اللہ) نے بھی سلامِ مسنون فرمایا ہے۔

ممنونِ کرم، طالبِ دعا

خادم وصل بلگرامی

تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر

سہ شنبہ ۱۱ مارچ سنہ ۴۱ء

مولانا المعظم، ذي المجد والكرم، أكرمكم الله تعالىٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

نامۂ نامی وصحیفۂ گرامی مجھے ۲؍ مارچ کو وصول ہوکر باعثِ اعزاز اور کاشفِ خیریت وحالات ہوا تھا، یہ وہ حالت تھی کہ میں بخار میں تھا، یہی وجہ ہوئی کہ جواب میں مجبوراً تاخیر ہوئی، جس کے لیے آپ سے عذرخواہ اور طالبِ معافی ہوں، ورنہ یہ ناسمجھی تھی کہ میں جواب میں ذرا بھی تاخیر کرتا۔ آپ اکثر یاد

آتے ہیں، اور مجلس میں بھی کبھی کبھی جناب کا ذکر میری زبان سے نکل جاتا ہے، خدا آپ کو آپ کے مقاصد میں کامیاب فرمائیں، اور جس گوہرِ مراد کی آپ کو طلب ہے، وہ حاصل ہو۔

میں نے آپ کا مکرمت صحیفہ، اول سے آخر تک پڑھا، لفظ (بلفظ) پڑھا اور بغور پڑھا، مجھ پر جو اثر ہوا وہ قابلِ عرض نہیں۔ کاش، بلا تکلف، اور بغیر کسی موانع کے وہم کے یہی سب واقعات حضرت اقدس (مولانا اشرف علی تھانوی صاحب) مدظلہم العالی کے حضور میں آپ پیش فرما دیتے، اور تمام حالات سے آگاہ کر کے اپنا منشا ظاہر فرما دیتے، اور جس چیز کی طلب ہے، اس کو ظاہر کر دیتے تو میرے خیال میں آپ کو بہت آسانیاں بہم ہو جاتیں، آپ کی تشویشات جاتی رہتیں، آپ کو ایک شاہراہ معلوم ہو جاتی، اور منزلِ مقصود کا وہ راستہ جس کی آپ کو تلاش ہے، سامنے آ جاتا۔ میرے خیال میں خدا کی طرف سے یہ تحریک شروع ہوئی ہے، آپ کے دل میں اسی نے ڈالا، آپ کے دل میں جوش پیدا ہو چلا ہے، اور اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنے من وعن حالات حضرت اقدس (تھانوی) مدظلہم العالی کے حضور میں پیش کر دیں، اور ان میں ذرا سا بھی میرا حوالہ، یا میں نے کیا رائے دی تھی؟ یا مجھ سے کیا باتیں ہوئی ہیں، یا خط وکتابت ہوئی تھی، یہ کچھ نہ ہو، صرف اپنے اول سے آخر تک کے حالات ہوں، جس چیز کے لیے بے قراری ہے، اس کا ذکر ہو، اور حضرت اقدس سے جو کچھ آپ چاہتے ہیں، اس کا صاف صاف اظہار ہو، اور بس!

(۱) بچپن سے گرچہ (تصوف) کا شوق تھا

(۲) والدین کی برکات

(۳) طالب علمی کے زمانہ میں بیعت کا خیال

(۴) علمی اشتغال کا مانع ہونا

(۵) کتبِ تصوف کا مطالعہ

(۶) ''حصنِ حصین'' کی ادعیہ کا معمول دس بارہ برس کی عمر سے

(۷) ''صحیحین'' وغیرہ سے انتخاب اور ان کا معمول

(۸) بعد کو مصمم ارادہ کسی بزرگ سے بیعت کا

(۹) ایک کابلی بزرگ نقشبندی سے ملاقات

(۱۰) ان سے بیعت کا ارادہ

(۱۱) ان کا استخارہ کے لیے فرمانا

(۱۲) استخارہ میں چار بزرگوں کی طرف خیال اور ان کا ذکر

(۱۳) خواب میں پیغمبران علیہم السلام کا دیکھنا

(۱۴) استخارہ میں بجز اتباعِ سنت کے اشارہ اور کچھ نہ معلوم ہونا

(۱۵) اُن بزرگ کا کسی شغل کا بتانا

(۱۶) کتبِ تصوف کے مطالعہ کا خاص شوق

(۱۷) ''رسالہ قشیریہ'' (علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ)، ''إحیاء'' (''إحیاء العلوم'' امام غزالی رحمہ اللہ)، حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کی تصانیف ورسالے اور حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ کی تصانیف، حضرت حاجی (امداد اللہ مہاجر مکی) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف، مکتوباتِ حضرت امام ربانی (مجدد الف ثانی رحمہ اللہ) اور (مکتوباتِ) خواجہ معصوم رحمہ اللہ، التکشف (حضرت تھانویؒ) کا مطالعہ اور ان کے اثرات

(۱۸) ''التکشف'' کے مطالعہ سے آپ پر اضطراری اثر ہونا

(۱۹) اُس وقت حضرت اقدس (تھانویؒ) کی علمی منزلت کا اضطراری معتقد ہونا اور اس موضوع پر حضرت اقدس کی نسبت خیالات

(۲۰) پہلے عقیدت مندی کیسی تھی؟ اور اب کیسی ہے؟

(۲۱) مولانا شفیع الدین صاحب (نگینوی) زادمجدہم سے ملاقات، بیعت، تعلیم تربیت اور ہر ایک کا مفصل تذکرہ

(۲۲) پیغام کا مفصل ذکر

(۲۳) پیغام کا خود پہنچنا

(۲۴) جو جو شغل یا تعلیم ہوئی ہو، اس کا ذکر۔

غرض اول سے آخر تک جس قدر مجھے تحریر فرمایا ہے، ان سب باتوں کا تذکرہ فرما کر اب جو کچھ آپ چاہتے ہوں، جو آپ کا منشا ہو، بلا تکلف، بلا پس وپیش سب کچھ لکھ ڈالیے، جو پوچھنا ہو پوچھیے، اور جس چیز کی درخواست آپ کی ہو، وہ لکھیے۔

خدائے برتر وبزرگ نے آپ کو اعلیٰ خاندان میں پیدا کیا، والد صاحب (مولانا محمد زکریا بنوری رحمہ اللہ) کے برکات آپ کو حاصل ہوئے، اللہ تعالیٰ نے علم وفضل دیا، زیارتِ حرمین شریفین سے مُشرّف فرمایا، مصر وغیرہ کے سفر کی توفیق دی، بڑے بڑے بزرگوں سے ملایا، خواب میں نہ معلوم کس کس کی زیارت سے سرفراز فرمایا، روزی کی طرف سے مطمئن کیا، دینی خدمات کا شرف بخشا۔ اب کیا ہے؟

صرف وہ راستہ طے کرنا جس سے جلد منزلِ مقصود تک پہنچنا ہو جائے۔ یہ بات غالباً ظاہری علم وفضل اور کتابوں سے ماوراء ہے، یہ صرف شیخِ کامل اور محقق مرشد کی صحبت ہی سے ہوسکتا ہے، اُس سے تعلق رکھنے سے یہ ہوسکتا ہے، اُس کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے سے ہوسکتا ہے، اور اپنی طلب سے ہوسکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ دے سکتا ہے۔

میں نے یہ کبھی نہیں کہا اور نہ اب کہتا ہوں کہ آپ حضرت اقدس ہی سے تعلق رکھیے، میرا منشا یہ تھا اور ہے کہ جس کو آپ کا دل کہے، اُس سے تعلق رکھیے، اور اُس سے رجوع کیجیے، لیکن چونکہ آپ نے حضرت اقدس کا تذکرہ فرمایا، اس لیے یہ سب میں نے لکھ دیا۔

میں بخار میں ہوں، اور اس حالت میں یہ لکھ رہا ہوں، اس لیے اگر کچھ غلط اور بے ربط لکھ گیا ہوں، معاف فرمایئے۔ جب حضرت اقدس کو آپ لکھیں، مجھے بھی ساتھ اطلاع دے دیں کہ آپ نے اس مضمون کا عریضہ لکھا ہے، اور بس، اس کے علاوہ اور جو خدمت آپ میرے لائق محسوس فرمائیں، میں حاضر ہوں۔ خدا کرے آپ میری موجودگی میں آئیں، میں مارچ کے پورے مہینے میں یہیں رہوں گا۔ آپ کا کب تک قصد ہے؟ اپنی خیریت .... سے ممتاز فرمائیں۔

خادم وصل بلگرامی

تھانہ بھون، ضلع مظفرنگر

۱۷ مارچ سنہ ۴۱ء

مولانا المعظم، ذي المجد والكرم، أكرمكم الله تعالىٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گرامی صحیفہ نے شرفِ صدور فرمایا، اور کاشفِ خیریت وحالات ہوا۔ آپ کی اس محبت، نوازش اور یادآوری کا بے حد شکرگزار ہوں۔

جب آپ یہاں تشریف لائے تھے اور زبانی گفتگو ہوئی تھی، اُس وقت بھی میں نے یہی عرض کیا تھا کہ جو بزرگ آپ کے انتخاب میں آئیں، جن سے آپ کی طبیعت اور آپ کے مزاج کو لگاؤ ہو، اُن سے رجوع فرمایئے، وقت کو غنیمت سمجھیے، اور کام شروع کر دیجیے، نہ اس میں تکلف کی ضرورت، نہ واسطے کی حاجت۔ پھر تحریرًا یہی عرض کیا کہ بغیر کسی امر کا خیال کیے ہوئے جتنے ضروری حالات کا ظاہر کرنا ہو، اگر آپ حضرت اقدس (تھانویؒ) پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں، حضرت اقدس سے رائے لینا چاہتے ہیں، اُن

سے مشورہ مناسب سمجھتے ہیں، یا اگر بالذات بغیر میرے عرض کیے ہوئے آپ اصلاح یا تعلیم حضرت اقدس مدظلہم العالی سے چاہتے ہیں تو بسم اللہ کر کے اپنے ضروری حالات لکھیے، اور اپنا منشا بے کم و کاست ظاہر فرمایئے کہ آپ اب کیا چاہتے ہیں؟ اور ان حالات کے ظاہر کرنے سے غرض کیا ہے؟ پھر ان شاء اللہ! بلا کسی تکلیف وتکلف ان شاء اللہ (هٰكذا في الأصل مكرَّراً) حضرت اقدس مدظلہم العالی جواب عطا فرمائیں گے۔ جواب گو مختصر ہوگا، مگر ان شاء اللہ بے حد جامع اور نافع ہوگا، آپ مراسلت کر کے تو دیکھیے۔ میرے ان الفاظ سے ترغیب نہ سمجھیے کہ شاید میں حضرت کی طرف آپ کو رجوع کرنے کی رغبت دے رہا ہوں، نہیں، ہرگز نہیں، اگر آپ کا دل قطعی طور رجوع (کا) ہو تو بلا تکلف کہیے، اور برابر کہتے رہیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے؟!

میں نے آپ کا پہلے کا حال حضرت اقدس کے بھی عرض کیا، کل جب مجھے آپ کا نامۂ نامی ملا، وہ مجلسِ عام تھی، اُس کا بہت سا ضروری حصہ ضروری (هٰكذا في الأصل) پڑھ کر سنایا، کیونکہ آپ نے یہی مجھے حکم دیا، اور میں نے یہ بھی عرض کر دیا کہ اس سے پہلے ایک اور طویل خط آیا تھا، میں نے لکھ دیا ہے کہ حضرت اقدس سے براہِ راست رجوع فرمایئے، یہی مناسب ہے۔ حضرت اقدس مدظلہم العالی نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ: ''ہاں! اُن کی طبیعت خود بغیر کسی کی ترغیب کے مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے، یا اپنے حالات بیان کر کے کچھ جواب چاہتی ہے تو وہ مجھے لکھیں۔ ان شاء اللہ جو مجھ سے خدمت ہو سکے گی، عذر نہ ہوگا، نہ اس میں کسی واسطے کی ضرورت ہے، نہ خوف ہے، نہ ڈر ہے۔''

واقعی آپ اگر ضرورت سمجھتے ہیں تو براہِ راست لکھیے، ان شاء اللہ شافی اور تسکین بخش جواب ملے گا۔

ہاں! اتنا ممکن ہے کہ مجھے بھی اطلاع دے دیا کیجیے کہ میں نے یہ لکھا اور آج لکھا، تاکہ میں بھی آپ کی بدولت کچھ فیض یاب ہو جاؤں۔ جواب ضرور عطا فرمایئے اور مراسلت شروع کر دیجیے۔

میری جو رائے تھی، وہ میں نے مختصراً عرض (کر دی) ہے، اب جو ارشاد ہو تعمیل کی جائے۔

حضرت اقدس مدظلہم العالی کو آپ سے کافی محبت ہے، ان شاء اللہ آپ کو سکون ہو جائے گا۔

نیاز کیش

وصل بلگرامی

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

رائے، اہلِ رائے اور فقہائے حنفیہ!

مفتی عبید الرحمٰن
مایار، مردان

’’رائے‘‘ کا مفہوم وتعارف

’’رائے‘‘ کا لفظ عربی زبان میں تجویز ومشورہ، خیال واعتقاد، عقل وتدبیر اور غور وفکر وغیرہ معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ’’اہلِ رائے‘‘ کا لفظ ان افراد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو رائے کے ساتھ زیادہ ربط وتعلق رکھتے ہیں۔ دریافت طلب سوال یہ ہے کہ:

الف: اہلِ رائے کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟ کون اس لفظ کا مصداق بنتے ہیں؟

ب: اس کی حیثیت ومقام کیا ہے؟ کیا یہ مدح ومنقبت کا لفظ ہے یا مذمت کا عنوان ہے؟

ان دونوں باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خود ’’رائے‘‘ کے لفظ کی حقیقت اور اس کی حیثیت ومقام کو جاننا ضروری ہے۔ اہلِ علم کے ہاں رائے کا لفظ مختلف مفاہیم ومقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے، کبھی تو تردید ومذمت کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ بسا اوقات مدح وتعریف کے سیاق میں اس کا اطلاق ہوتا ہے، جہاں مذمت مقصود ہو وہاں اس کا مقصود کچھ ہوتا ہے اور جہاں مدح ومنقبت کے سیاق میں واقع ہو، وہاں اس کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے، یہ کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز کو ایک ہی وقت اچھا بھی کہا جائے اور بُرا بھی قرار دیا جائے!

علامہ ابن القیمؒ کی تحقیق

علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید کتاب ’’إعلام الموقّعین‘‘ میں اپنے مزاج ومذاق کے مطابق اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

’’وإذا عرف هٰذا فالرأي ثلاثة أقسام: رأيٌ باطل بلا ريب، ورأيٌ صحيح، ورأي هو موضع الاشتباه، والأقسام الثلاثة قد أشار إليها السلف، فاستعملوا الرأي الصحيح، وعملوا به وأفتوا به، وسوغوا القول به،

وذموا الباطل، ومنعوا من العمل والفتيا والقضاء به، وأطلقوا ألسنتهم بذمه وذم أهله.

والقسم الثالث: سوغوا العمل والفتيا والقضاء به عند الاضطرار إليه حيث لا يوجد منه بد، ولم يلزموا أحدا العمل به، ولم يحرموا مخالفته، ولا جعلوا مخالفه مخالفًا للدين، بل غايته أنهم خيروا بين قبوله ورده؛ فهو بمنزلة ما أبيح للمضطر من الطعام والشراب الذي يحرم عند عدم الضرورة إليه.''(۱)

ترجمہ: ''اسی بنا پر رائے کی تین قسمیں ہیں: باطل رائے، صحیح رائے اور مشتبہ رائے۔ ان تینوں اقسام کی طرف سلف نے اشارہ کیا ہے۔ رائے صحیح کو استعمال کیا ہے، اس پر عمل کیا ہے اور اس پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اور باطل رائے کی مذمت بیان کرکے اس پر عمل کرنے، اس پر فتویٰ دینے اور اس پر فیصلہ کرنے سے منع کیا ہے، اور رائے اور اہل الرائے کی خوب مذمت کی ہے۔

اور تیسری قسم پر اضطرار کے وقت جب کوئی دوسرا چارہ نہ ہو عمل، فتویٰ اور قضاء کو جائز قرار دیا ہے، اور کسی پر اس پر عمل کرنے کو لازم نہیں سمجھا اور نہ اس کی مخالفت کو حرام کہا ہے اور نہ اس کے مخالف کو دین کا مخالف کہا ہے، بلکہ اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں اختیار دیا ہے، جس طرح حالتِ اضطرار میں مضطر کے لیے حرام چیز بقدرِ ضرورت حلال ہو جاتی ہے۔''

اس کے بعد غلط و مذموم رائے کی پانچ مختلف قسمیں اور درست رائے کی چار متنوع صورتیں اور متعلقہ تفصیلات ذکر فرمائی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ:

❶۔ ''رائے'' کوئی ایسا شجرہ ممنوعہ نہیں ہے جو بہر حال مذموم و ممنوع ہی ہو۔

❷- اسی طرح یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ سلف صالحین نے جہاں ''رائے'' یا ''اہلِ رائے'' کی مذمت کی ہے، اس سے ایک مخصوص قسم کی رائے ہی مراد ہے، جس کی مذمت بالکل بجا بلکہ دینی حدود کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

❸-''رائے'' کا استعمال صرف فقہائے/حنفیہ یا متاخرین علماء نے ہی نہیں کیا، بلکہ سلف کے ہاں اس کا معمول رہا ہے۔ علامہ ابن قیم مرحوم کی صراحت کے علاوہ بھی یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جن کا کسی منصف مزاج عقل مند شخص سے انکار متصور نہیں ہے۔

رائے کی حیثیت جاننے کی کسوٹی

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ''رائے'' کی کونسی قسم مذموم و ممنوع ہے اور کونسی نوع ممدوح و مطلوب؟ ان اقسام کو جاننے کا معیار و مدار کیا ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف اہلِ علم نے اس پر مختلف انداز میں گفتگو فرمائی ہے۔ خود علامہ ابن القیمؒ نے درج بالا عبارت کے بعد اس پر بڑے بسط وتفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ تاہم اصولی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو درج ذیل دو نکات کو سامنے رکھ کر کسی رائے کی حیثیت ومقام معلوم کیا جا سکتا ہے:

الف: ''رائے'' کی بنیاد واساس کیا ہے؟ کیا رائے کی عمارت ایسے امور پر استوار ہے جن کو شرعی دلیل کا درجہ حاصل ہے؟ یا ان کے علاوہ ظن وتخمین اور اتباعِ ہویٰ وغیرہ ایسے امور پر رائے کی بنیاد کھڑی ہے جن کو شرعی دلیل کا مرتبہ حاصل نہیں ہے؟

ب: ''رائے'' کا مقصود وغرض کیا ہے؟ کیا اس کی بنیاد پر کسی غیر منصوص درپیش مسئلہ کا شرعی حکم دریافت کرنا منظور ہے؟ یا کسی منصوص حکم میں تغیر وتبدیلی کرنی مطلوب ہے؟

اب اگر کوئی رائے ایسی ہو جو درج بالا دو شقوں میں سے پہلی پہلی شق کی حامل ہو تو وہ رائے درست ہے، ورنہ تو درست نہیں ہے، لہٰذا اس کے مطابق اگر کوئی رائے ایسی ہو جس میں درج بالا دونوں شرطیں پائی جائیں، یعنی ایک تو اس کی بنیاد کسی ایسی چیز پر ہو جس کو شرعی نقطۂ نظر سے دلیل کا درجہ حاصل ہو اور ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے کسی منصوص حکم کو نہ چھوڑا جائے تو ان دو شرائط کے ہوتے ہوئے جو ''رائے'' ہوگی، وہ قابلِ قدر اور درست ہوگی اور اگر دونوں میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو وہ رائے ممنوع ومذموم ہے۔

''اہلِ رائے'' کی اصطلاح کے مختلف استعمالات

اہلِ علم کی کتابوں میں جہاں ''اہلِ رائے'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہاں اس کے سیاق وسباق اور اس کے متقابل ومتضاد پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور ان باتوں کو دیکھ کر ہی اصل مقصود تک رسائی ممکن ہے، چنانچہ:

①- بعض اوقات تو یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو محض اپنے گمان وتخمین سے شرعی احکام ثابت کرنے کی جسارت کرتے ہیں، قرآن وحدیث کی طرف مراجعت کرنے اور وہاں پیش آمدہ مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھاتے۔

②- بسا اوقات یہ اصطلاح ان بے نصیب قسم کے لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو قرآن وحدیث کے منصوص مسائل کو بھی اپنی عقلِ ناتواں کی کسوٹی پر پرکھ کر جانچتے ہیں اور اس پیمانے پر پورا اُترنے کے بعد ہی اس کو تسلیم کرنے کی زحمت کرتے ہیں۔

③- بعض جگہ یہ عنوان ''اہلِ حدیث'' کے متقابل کے طور پر ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف حدیث کے الفاظ یاد کرنے ہی کی مہارت نہ دی ہو، بلکہ ساتھ تفقُّہ کی عظیم دولت سے بھی نوازا ہو۔

۴-بعض مقامات پر اس کا اطلاق فقہائے کرام کے طبقے میں سے بھی سب پر نہیں ہوتا، بلکہ ان میں سے خاص انہی حضرات پر ہوتا ہے جن کو علمی سطح پر خاص طور پر یہ ذوق نصیب ہوا ہے اور عملی سطح پر وہ اس کے ساتھ زیادہ اعتنا رکھتے ہوں۔

اہلِ رائے کا مصداق

اب پہلے دو معانی کے لحاظ سے یہ عنوان مذمت کا ہے اور جو لوگ اس معنی میں اہلِ رائے کہلاتے ہیں، وہ گمراہی کے شکار ہیں۔ تیسرے مفہوم کے لحاظ سے یہ اصطلاح چاروں ائمہ مجتہدین کے لیے استعمال ہوتی ہے، البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں چونکہ عام طور پر حدیث کے ظاہر پر عمل ہوتا تھا، اس لیے اُن کو اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابن عبدالبرؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہائے مجتہدین متبوعین کے حالات پر جو کتاب لکھی، اس میں آپؒ کا تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ اس کا نام ہی یہ رکھا: ''الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء''۔ چوتھے استعمال کے لحاظ سے یہ لفظ عام طور پر حضرات فقہائے احناف کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ بعض اوقات ان کے ساتھ موالک اور بسا اوقات شوافع کو بھی ملایا جاتا ہے۔

بہر حال آخری دونوں مفہوموں کے لحاظ سے اہلِ رائے کا لفظ لائقِ تعریف اور قابلِ مدح ہے، یہ کسی مذمت یا ممانعت کا باعث نہیں ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے نائب شیخ الاسلام علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ اپنی ایک مفید تحریر ''فقه أهل العراق'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''فالرأي بهٰذا المعنى وصفٌ مادحٌ يوصف به كل فقيه، ينبئ عن دقة الفهم، وكمال الغوص. ولذٰلك تجد ابن قتيبة يذكر في "كتاب المعارف" الفقهاء بعنوان أصحاب الرأي، ويَعدُّ فيهم الأوزاعي، وسفيان الثوري، ومالك بن أنس رضي الله عنهم. وكذٰلك تجد الحافظ محمد بن الحارث الخشني يذكر أصحاب مالك في "قضاة قرطبة" باسم أصحاب الرأي. وهٰكذا يفعل أيضاً الحافظ أبو الوليد بن الفرضي في "تاريخ علماء الأندلس.''

ترجمہ: ''اس معنی کے لحاظ سے ''رائے'' ایک اچھی صفت ہے جس سے ہر فقیہ متصف ہوتا ہے، جو اچھی فہم اور کمالِ تجربہ کی دلیل ہے، چنانچہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی ''كتاب المعارف'' میں فقہاء کرام کو اصحابِ رائے کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں، جن میں امام اوزاعی، سفیان ثوری، امام مالک بن انس رحمہم اللہ کو بھی گردانتے ہیں۔ نیز امام حافظ محمد بن حارث خشنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''قضاةُ قرطبة'' میں امام مالکؒ کے اصحاب کو بھی ''اہلِ رائے'' کے نام سے ذکر کرتے ہیں،

نیز حافظ ابوالولیدؒ کا طرزِ عمل بھی اپنی کتاب تاریخ علماء اندلس میں یہی ہے۔‘‘

اس کے کچھ سطر بعد فرماتے ہیں:

’’وأما تخصيص الحنفية بهٰذا الاسم، فلا يصح إلا بمعنى البراعة البالغة في الاستنباط، فالفقه حيثما كان يصحبه الرأي، سواء كان في المدينة أو في العراق.‘‘(۲)

ترجمہ: ’’فقہاء حنفیہ کو خصوصی طور پر اہلِ رائے میں سے شمار کرنا بھی کمالِ استخراج واستنباط کی بنیاد پر ہے۔ فقہی مسائل کے ساتھ لگاؤ جن کا بھی ہوگا مدینہ میں ہو یا عراق میں، وہاں رائے اوراجتہاد کا تذکرہ ہوگا۔‘‘

لیکن علمی دیانت اور اصولی مہارت کے قحط یا فقدان کا کرشمہ ہے کہ ان جیسی اصطلاحات میں خلط ملط سے کام لے کر قابلِ تعریف پہلو لائقِ مذمت اور باعثِ مذلت گردانا جاتا ہے اور بعض اوقات اس قدر زور وقوت کے ساتھ یہ اشکال اُٹھایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے مخاطب حق پر ہونے کے باوجود بھی اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر براءت کرنے پر ایک گونا مجبور ہوتا ہے۔ اس جہاں کی نیرنگی کا کیا کہئے کہ بسا اوقات کوئی کارِ خیر اور عنوانِ فضل وکمال بھی باعثِ ننگ وعار بن جاتا ہے! حنفیہ کو اہلِ رائے کیوں کہا جاتا ہے؟ اس حوالہ سے علامہ عبدالعزیز بخاری رحمۃ اللہ علیہ امام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’وهم أصحاب الحديث والمعاني، أما المعاني فقد سلم لهم العلماء أي سلموها لهم إجمالًا وتفصيلًا أما إجمالًا؛ فلأنهم سموهم أصحاب الرأي تعبيرًا لهم بذٰلك، وإنما سموهم بذٰلك لإتقان معرفتهم بالحلال والحرام واستخراجهم المعاني من النصوص لبناء الأحكام ودقة نظرهم فيها وكثرة تفريعهم عليها وقد عجز عن ذٰلك عامة أهل زمانهم فنسبوا أنفسهم إلى الحديث وأبا حنيفة وأصحابَهُ إلى الرأي.‘‘(۳)

ترجمہ: ’’اور وہ اصحابِ حدیث ومعانی ہیں اور علماء نے ان معانی کو اجمالاً اور تفصیلاً ان کے سپرد کیا ہے، اسی وجہ سے ان کو اصحابِ رائے کہا گیا ہے اور یہ لوگ اچھی طرح حلال اور حرام کو جانتا ہے اوراحکام کی بنا کے لیے نصوص سے معانی نکال کر اس میں دقیق نظر کر کے اس پر تفریعات کرتے ہیں، اور جب اس سے عام اہلِ عصر عاجز ہوئے تو اپنی نسبت حدیث کی طرف کی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کی نسبت رائے کی طرف کی اور ان کو اصحابِ رائے کہا۔‘‘

کیا قیاس رائے ہے؟

فقہائے کرام کو عموماً اور حضرات حنفیہ کو خاص طور پر جو اہلِ رائے کہا جاتا ہے، وہ قیاس کے

استعمال کرنے اور اس کے ذریعے شرعی احکام کے استنباط واستخراج کرنے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے اور اصولی کتابوں میں بار بار اس کی تصریح بھی کی جاتی ہے کہ قیاس محض ''مُظہِر حکم'' ہوتا ہے ''مُثبِتِ حکم'' نہیں ہوتا، یعنی قیاس کے ذریعے نئے سرے سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مقیس میں پہلے سے جو حکم موجود ہوتا ہے، قیاس کے ذریعے اسی کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب قیاس کی یہ حیثیت تسلیم ہے تو اس کے بعد قیاس کرنے کی وجہ سے اہلِ رائے کی بنیاد ہی ختم ہوجاتی ہے۔

کیا فقہائے احناف اہلِ رائے ہیں؟

ایک عرصہ ہوا کہ بعض طبقات کی جانب سے فقہائے احناف کے متعلق دیگر مجتہدین کرام کی بنسبت زیادہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور اہلِ رائے کہہ کہہ کر ان کی مذمت کی جاتی ہے، حالانکہ درج بالا سطور سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ خود اہلِ رائے ہونا کوئی مذمت کا متقاضی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود حقیقتِ حال یہ ہے کہ جس طرح مجتہدین احناف کے ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کو خصوصی طور پر اہلِ رائے قرار دیا جاتا ہے، یوں ہی دیگر مجتہدین کرام کے ہاں بھی متعدد ایسی چیزیں موجود ہیں۔ فقہائے احناف کے بالمقابل عام طور پر شوافع کا ذکر آتا ہے اور ان کو حنفیہ کی بنسبت زیادہ عامل بالحدیث گردانا جاتا ہے، جبکہ ان کے ہاں بھی متعدد ایسے ضوابط موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ حنفیہ کی بنسبت زیادہ اہلِ رائے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

یاد رہے کہ شوافع کو اہلِ رائے قرار دینے کا مقصد ان کی مذمت کرنا نہیں ہے، بلکہ سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہو یا دیگر مجتہدین کرام، جن کے علم و اجتہاد کو اُمت نے قبول کیا ہے، وہ سب ہمارے سروں کے تاج، اُمت کا سرمایہ اور بڑی قابلِ قدر ہستیاں ہیں، ہم ان کی گستاخی، مذمت اور بے ادبی سے ہزار ہزار بار اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یہاں تو صرف اصولی جائزہ لینا مقصود ہے کہ شوافع کی بنسبت حنفیہ کو اہلِ رائے کہنا اور ان کی طرف حدیث سے دور ہونے یا حدیث دشمنی کرنے کی نسبت کرنا بالکل درست نہیں ہے۔

قاضی محب اللہ بہاریؒ کی مفید تحقیق

علماءِ ہند میں سے حضرت علامہ قاضی محب اللہ بہاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس موضوع پر ایک رسالہ ہے جو تلاش کے باوجود مطبوع یا مخطوط کسی شکل میں تو دستیاب نہیں ہوسکا، تاہم علامہ عبدالحئی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نزھۃ الخواطر'' میں موصوف کے حالات کے ضمن میں اس کا خلاصہ نقل فرمایا ہے۔ اس میں موصوفؒ نے سات ایسے ضوابط اور وجوہات ذکر فرمائے ہیں جن کی بنیاد پر احناف کا شوافع کی بنسبت زیادہ عامل بالحدیث ہونا اور شوافع کا اہلِ رائے ہونا واضح ہوتا ہے، وہ سات ضوابط اور وجوہات درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ: حنفیہ کے نزدیک عام قطعی ہوتا ہے، چاہے اس کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ ہو یا سنت رسول ﷺ کے ساتھ، لہٰذا قیاس ورائے کے ذریعہ اس کی تخصیص درست نہیں ہے، جبکہ شوافع کے نزدیک وہ ظنی ہوتا ہے اور قیاس کے ذریعے بھی اس میں تخصیص کی جاسکتی ہے۔

دوسری وجہ: حنفیہ کے نزدیک نصِ مطلق کو اپنے اطلاق پر برقرار رکھنا ضروری ہے اور قیاس کے ذریعہ اس کو مقید کرنا جائز نہیں ہے، جبکہ شوافع کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے۔

تیسری وجہ: حنفیہ کے نزدیک مرسل احادیث معتبر ہیں اور قیاس ورائے کی بنسبت وہی مقدم ہیں، جبکہ شوافع کے نزدیک عام حالات میں مرسل روایات کا اعتبار نہیں ہے اور قیاس ورائے کا درجہ اس سے مقدم ہے۔

چوتھی وجہ: صحابیؓ کی کوئی بات اگر ایسی ہو جو مدرک بالرأی نہ ہو تو حنفیہ کے نزدیک وہ سنت کے ساتھ ملحق ہے اور رائے وقیاس پر بہرحال اس کو مقدم رکھا جائے گا، جبکہ شوافع کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔

پانچویں وجہ: کسی عبادت میں جزء یا شرط کا اضافہ کرنا شوافع کے نزدیک تخصیص وتقیید ہے، لہٰذا قیاس ورائے کی بنیاد پر بھی ایسا کرنا درست ہے، جبکہ حنفیہ کے نزدیک ایسا کرنا اس کی حیثیت نسخ کی ہے، لہٰذا قیاس کا یہاں اعتبار نہیں ہے۔

چھٹی وجہ: حنفیہ کے نزدیک علت کے معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کسی نص یا اجماع سے اس کا مؤثر ہونا ثابت ہو، جبکہ شوافع کے نزدیک تاثیر کا ثابت ہونا ضروری نہیں ہے۔

ساتویں وجہ: حنفیہ حدود اور کفارات کے باب میں رائے وقیاس کے قائل نہیں ہیں، جبکہ شوافع کے نزدیک ایسا کرنا درست ہے۔ (۴)

آٹھویں وجہ: امام فخر الاسلام بزدوی رحمہ اللہ نے ''اصول بزدوی'' کے مقدمہ میں اس بات کی تفصیل ذکر فرمائی ہے کہ فقہائے حنفیہ اہل رائے ہونے اور اس میں سبقت کا مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت پر عمل کرنے میں بھی دیگر مجتہدین کی بنسبت زیادہ فائق ہیں، اس ضمن میں ایک وجہ یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ ان کے ہاں مجہول راوی کی روایت قیاس ورائے پر مقدم ہے، جبکہ دیگر مجتہدین کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''وأصحابنا هم السابقون في هٰذا الباب ولهم الرتبة العليا والدرجة القصوى في علم الشريعة ... وهم أولٰى بالحديث أيضًا ألا ترى أنهم جوزوا نسخ الكتاب بالسنة ... وقدموا رواية المجهول على القياس.'' (۵)

ترجمہ: ''اور ہمارے اصحاب اس باب میں آگے ہیں اور ان کو علمِ شریعت میں اونچی درجہ اور رتبہ حاصل ہے، اور ان کو حدیث میں بھی مہارت حاصل ہے، جیسا کہ انہوں نے کتاب اللہ کو

سنت کے ذریعے منسوخ ہونے کو جائز قرار دیا ہے اور مجہول روایت کو قیاس پر مقدم کیا ہے۔‘‘

خلاصہ

ان وجوہات سے معلوم ہوا کہ رائے یا اہلِ رائے کا لفظ مطلقاً مذمت کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور جن اسباب وضوابط کی بنیاد پر کسی جماعت کو اہلِ رائے قرار دیا جاتا ہے، وہ صرف فقہائے حنفیہ ہی کے ہاں نہیں ہیں، بلکہ دیگر فقہائے مجتہدین کے ہاں بھی ایسے مختلف ضوابط پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ فقہائے شافعیہ کے ہاں حنفیہ کی بنسبت ایسی وجوہات کچھ زیادہ موجود ہیں جن کی بنا پر کسی جماعت کو اہلِ رائے میں سے گردانا جاتا ہے، اگرچہ اس سے فقہائے شافعیہ کی تنقیص، مذمت یا عیب جوئی مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کے فقہی ذوق کو اُجاگر کرنا مطلوب ہے، کیونکہ رائے کے بغیر حدیث کے ظاہر ہی کو ہر جگہ مراد لینا کافی نہیں ہوتا۔ امام بزدوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

’’وقال محمد - رحمه الله تعالىٰ - في كتاب أدب القاضي: لا يستقيم الحديث إلا بالرأي ولا يستقيم الرأي إلا بالحديث حتى أن من لا يحسن الحديث أو علم الحديث ولا يحسن الرأي، فلا يصلح للقضاء والفتوى وقد ملأ كتبهٗ من الحديث، ومن استراح بظاهر الحديث عن بحث المعاني ونكل عن ترتيب الفروع على الأصول انتسب إلىٰ ظاهر الحديث.‘‘ (۲)

ترجمہ: ’’امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب ’’أدب القاضي‘‘ میں لکھا ہے کہ حدیث رائے کے بغیر صحیح نہیں ہوئی اور رائے حدیث کے بغیر صحیح نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اگر کوئی حدیث یا علمِ حدیث اور رائے کو نہیں جانتا ہو اور اس کے کتب خانے حدیث سے بھرے ہوں، پھر بھی وہ قضاء اور فتوے کا اہل نہیں ہے، اور اگر کوئی معانی کی بحث میں ظاہرِ حدیث سے استدلال کریں اور اصول پر تفریعات کرنے سے انکار کریں تو ان کی نسبت ظاہرِ حدیث کی طرف ہوگی۔‘‘

حواشی وحوالہ جات

۱- إعلام الموقعين عن رب العالمين، فصل تأويل ما روي عن الصحابةؓ من الأخذ بالرأي، الرأي على ثلاثة أنواع، ج:۱، ص: ۵۳
۲- فقه أهل العراق وحديثهم، ص:۳۲
۳- كشف الأسرار شرح أصول البزدوي، العلم نوعان، النوع الثاني علم الفروع وهو الفقه، ج:۱، ص:۱۶
٤- نزهة الخواطر و بهجة المسامع والنواظر، ج:٦، ص:۷۹۳
۵- كشف الأسرار شرح أصول البزدوي، العلم نوعان، النوع الثاني علم الفروع وهو الفقه، ج:۱، ص:۱۵
٦- كشف الأسرار شرح أصول البزدوي، العلم نوعان، النوع الثاني علم الفروع وهو الفقه، ج:۱، ص:۱۵

محرم الحرام اور یوم عاشوراء
فضائل اور تاریخ

مولانا عبدالقوی ذکی حسامی
حیدرآباد دکن، انڈیا

تاریخی نظام اور اس کی ضرورت

سکینڈ سے گھنٹہ، گھنٹہ سے دن، مہینہ اور سال تک کے معمولات کو صحیح انداز اور مناسب تقسیم کرنے کو بزبانِ عربی تقویم، اردو میں نظام الاوقات، ہندی میں جنتری اور انگریزی میں کیلنڈر کہتے ہیں۔ اور وقت وہ شئے ہے جو اپنے محور میں گھومتا رہتا ہے۔ اسی وقت سے فرد سے قوم تک کے حالات وواقعات درج ہوکر ماضی کے حوالہ ہوجاتے ہیں، جس سے عبرت ونصیحت لے کر انسان اپنے مستقبل کے معاملات طے کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے لیے سیاسی، سماجی اُمور، معاشرتی تقریبات اور مذہبی فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک مرتب نظام کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر انسان کا مفوضہ ذمہ داری کو نبھانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

تاریخی نظام کی اقسام

اسی مقصد کے تحت دنیا میں مختلف نظام الاوقات رائج ہیں، عمومی طور پر دو نظام معروف ہیں:

❶-شمسی: جنوری سے دسمبر تک ❷-قمری: محرم الحرام سے ذوالحجہ تک۔

شمسی تاریخ کو عیسوی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے) نسبت حاصل ہے۔ اور نظامِ قمری ہجرتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب ہے۔ موجودہ دور میں عموماً سرکاری وغیرسرکاری، نجی وملکی تمام تر معاملات شمسی تواریخ کے لحاظ سے انجام پاتے ہیں، البتہ اسلامی احکامات وفرائض قمری نظام سے مربوط ہیں، جیسے: روزہ، زکوٰۃ، حج، عیدین، وغیرہ۔

قمری سن کی اہمیت

قمر لغتِ عربی میں چاند کو کہتے ہیں، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے قمری کہتے ہیں، کیونکہ اس نظام کا سارا دارومدار چاند کے گھٹنے اور بڑھنے پر منحصر ہے۔ اور یہ قمری تاریخی کیلنڈر نبی آخر الزماں ﷺ کے مقدس عمل ہجرت سے وابستہ ہے۔ (ماہِ محرم الحرام کے فضائل واحکام)

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ''إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ'' کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''قمری مہینوں کی جو ترتیب اسلام میں معروف ہے، وہ رب العالمین کے ترتیب کردہ ہیں، جس میں خاص مہینوں کے مخصوص احکام نازل فرمائے ہیں، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے یہاں احکامِ شرعیہ میں قمری سن معتبر ہے، اور یہ اللہ کو پسند ہیں، اسی لیے قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرضِ کفایہ ہے، اگر ساری اُمت قمری حساب کو ترک کردے تو گنہگار ہوگی۔ قمری حساب محفوظ رہے تو شمسی تواریخ کا استعمال بھی جائز ہے۔'' (معارف القرآن، ج:۴، ص:۳۷۳)

قمری سال کا پہلا مہینہ (محرم الحرام)

محرم کے معنی: معظم، محترم اور معزز ہیں، اس ماہ کا شمار اشہرِ حرم میں سے ہے، جن کی عظمت وفضیلت کتاب وسنت میں آئی ہے، جن میں اعمالِ صالحہ کا اجر وثواب دوگنا کرکے دیا جاتا ہے۔ یہ مہینہ ایسی بزرگی والا ہے جس کا ادب واحترام نزولِ کتاب کے زمانہ میں اہلِ کتاب اور کفارِ مکہ بھی کیا کرتے تھے۔ بعض علمائے سلف نے اشہرِ حرم میں بھی محرم الحرام کو افضل لکھا ہے، چنانچہ حافظ ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں:

''وقداختلف العلماء في أي الأشهرالحرم أفضل؟ فقال الحسن البصريؒ: أفضلها شهر الله المحرم، ورجَّحهٗ طائفة من المتاخرين.''

''علماء کرام نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ اشہرِ حرم میں کونسا مہینہ افضل ہے؟ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: ان میں افضل مہینہ اللہ کا مہینہ محرم ہے، اور متاخرین میں سے ایک جماعت نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔'' (خصوصیاتِ ماہِ محرم الحرام ویومِ عاشوراء)

محرم الحرام کے فضائل

ماہِ محرم الحرام ان چار مہینوں میں سے ایک ہے، جن کی حرمت وعظمت کو اللہ تعالیٰ نے کائنات بناتے وقت ہی لکھ دیا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ'' (سورۃ التوبہ:۳۶)

''یقیناً شمار مہینوں کا (جوکہ) کتابِ الٰہی میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری) ہیں جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے تھے (اسی روز سے اور) ان میں چار خاص مہینے ادب کے ہیں۔'' (حضرت تھانویؒ)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حرمت کے مہینوں میں نیک کام کرنے کا ثواب بہت بڑا ہے، لہٰذا ان میں گناہ کرنے کا عذاب بھی بہت بڑا ہے، اگرچہ گناہ ہر زمانہ میں (برائی کے لحاظ سے) بڑا ہوتا ہے۔'' (مظہری)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''تمام انبیاء کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال وعذاب بھی زیادہ ہوتا ہے۔'' (معارف القرآن)

علامہ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ: اسلاف تین عشروں کی بہت عظمت ولحاظ کرتے تھے: ①- رمضان المبارک کا آخری عشرہ، ②- ذی الحجہ کا پہلا عشرہ، ③- محرم الحرام کا پہلا عشرہ۔ (محرم الحرام کا مہینہ)

امام نسائیؒ نے اس ماہِ مبارک کی فضیلت پر یہ روایت نقل فرمائی ہے:

''عن أبي ذرؓ قال: سألتُ النبي ﷺ أيُ اليل خير؟ و أي الأشهر أفضل؟ فقال: خير اليل جوفه، وأفضل الأشهر شهر الله الذي تدعونه المحرم.''

''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ سے سوال کیا: رات کا کونسا حصہ بہتر ہے؟ اور کونسا مہینہ افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: رات کا درمیانی حصہ بہتر ہے، اور مہینوں میں افضل مہینہ اللہ کا مہینہ ہے، جس کو تم محرم کہتے ہو، لیکن ماہِ رمضان اس سے مستثنیٰ ہے۔'' (خصوصیاتِ ماہِ محرم الحرام)

محرم الحرام میں روزوں کی فضیلت

ماہِ محرم الحرام میں نفلی روزوں کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اس مہینہ کو اللہ سے نسبت حاصل ہے اور یہ نسبت ماہِ محرم کی فضیلت کو بتلاتی ہے، حدیث پاک میں ارشاد ہے:

''أفضل الصيام بعد رمضان شهر الله المحرم.'' (رواہ مسلم، بحوالہ مشکاۃ، رقم:۲۰۴۸)

''رمضان کے روزے کے بعد بہترین روزے اللہ کا مہینہ محرم ہے۔''

اس حدیث میں محرم کے عام نفلی روزے مراد ہیں اور یہی راجح قول ہے۔ (ماہِ محرم الحرام کے فضائل و احکام)

نیز فقہاء کرام اشہرِ حرم میں بطور خاص محرم کے مہینہ میں نفلی روزوں کے حسبِ حیثیت اور وسعت مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ (حوالہ سابق)

ماہِ محرم کے چند اہم تاریخی واقعات

ماہِ محرم ۷ ھ میں غزوۂ خیبر ہوا۔ ماہِ محرم ۱۴ ھ میں جنگ قادسیہ ہوئی، اس جنگ میں مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے اور کفار کا سردار مشہور زمانہ رستم تھا، تین دن کے سخت مقابلہ کے بعد چوتھے روز مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ماہِ محرم ۱۸ ھ شام اور عراق میں طاعونِ عمواس کی سخت جان لیوا وبا پھیلی تھی، اور حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کا انتقال بھی اسی بیماری سے ہوا جو اس وقت مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ اس علاقہ میں مصروفِ جنگ تھے۔ اور اسی سن میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے دمشق کے گورنر مقرر ہوئے۔ ماہِ محرم ۲۴ ھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر میں فاتحانہ داخل ہوئے، اور یہی وہ سن ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ ماہِ محرم ۶۱ ھ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مع رفقاء جامِ شہادت نوش کیا۔ ماہِ محرم ۶۷ ھ میں کوفہ کا گورنر عبیداللہ بن زیاد قتل ہوا۔ ماہِ محرم ۷۴ ھ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وفات ہوئی۔ (ملخص از ماہِ محرم الحرام کے فضائل اور احکام)

یہ وہ چند تاریخی اشارے ہیں جو محرم الحرام میں واقع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ بے شمار اور تاریخی حقائق کتبِ سیر میں مذکور ہیں۔

صومِ عاشوراء کے فضائل

صوم عاشوراء کی فضیلت محرم الحرام کے دیگر ایام سے بڑھی ہوئی ہے، اور احادیث میں اس کے فضائل وارد ہوئے ہیں، جمہور صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کی رائے یہی ہے کہ عاشوراء سے دس محرم کا روزہ مراد ہے، اور لغت کی رُو سے بھی عاشورہ کا لفظ دس محرم پر صادق آتا ہے:

''عن عائشةؓ قالت :كان رسول الله ﷺ أمر بصيام يوم عاشوراء، فلما فُرض رمضان كان من شاء صام ومن شاء أفطر.'' (بخاری:۲۰۰۱)

''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''رسول اللہ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔

جب رمضان کے روزے فرض کردیے گئے (اختیار دیا گیا) جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''

ایک حدیث میں اس دن کو اللہ رب العزت کا دن قرار دیا گیا، چنانچہ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت منقول ہے کہ:

'' قال رسول الله ﷺ: هٰذا يوم من أيام الله، فمن شاء صامه ومن شاء تركه.'' (ابوداؤد: ۲۴۴۳)

اور اس دن روزہ رکھنے کا ثواب یہ ہے کہ سال گزشتہ کے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔ حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ارشادِ نبوی (ﷺ) ہے:

'' وسئل عن صوم يوم عاشوراء، فقال يكفر السنة الماضية .'' (مسلم: ۱۱۲۶)

اس حدیث کے ضمن میں یہ بات ملحوظ رہے کہ گناہوں سے صرف صغائر معاف ہوں گے، البتہ کبائر کے لیے توبہ شرط ہے۔

تنہا صوم عاشوراء اور مخالفتِ یہود

یہود اسلام کے ازلی دشمن ہیں، ان کی مخالفت سنتِ نبوی ہے، اسی وجہ سے اسلام کے بیشتر احکامات میں ان کی مخالفت قولاً وعملاً کی گئی، ابتدا میں صرف ایک روزہ رکھا جاتا تھا، جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ یہود بھی روزہ رکھا کرتے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے ان کی مخالفت میں مزید ایک روزہ اضافہ کرنے کا حکم دیا، یا تو نو تاریخ کو روزہ رکھ لیا جائے، اس کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے ہوتی ہے:

''قال رسول الله ﷺ: صوموا التاسع والعاشر وخالفوا اليهود.'' (ترمذی: ۷۵۵)

یا نو تاریخ کے بجائے گیارہ تاریخ کو روزہ رکھ لیا جائے، اس کا ثبوت حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی ایک دوسری روایت میں ہے:

'' قال رسول الله ﷺ: صوموا يوم عاشوراء وخالفوا اليهود، صوموا قبله يوماً أو بعدهٗ يوماً.'' (مسند احمد)

فقہائے کرام نے ان ارشادات کی روشنی میں تنہا دس محرم کا روزہ رکھنا مکروہِ تنزیہی یعنی خلافِ اولیٰ لکھا ہے، اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف عاشوراء کا روزہ رکھنا گناہ ہے، یہ بے اصل بات ہے۔ (ماہ محرم کے فضائل اور احکام)

بعض اہلِ علم کی رائے ہے کہ فی زمانہ اہلِ یہود کے روزہ نہ رکھنے کی وجہ سے تشبہ نہیں پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اول اس کا قطعی علم نہیں کہ وہ روزہ رکھتے ہیں یا نہیں۔ (کذا فی فتاویٰ رحیمیہ، ج:۵،ص:۱۹۷) دوسرا یہ کہ نو اور گیارہ کا روزہ رکھنا منصوص ہے اور چودہ سو سال سے تعاملِ ناس ہے۔ (المغنی لابن قدامہ، بحوالہ حاشیہ ماہِ محرم کے فضائل اور احکام)

یومِ عاشوراء سے وابستہ تاریخ

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اس دن ہوئی، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جبلِ جودی پر اس دن ہی آٹھہری، حضرت یونس علیہ السلام اسی دن مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے خلاصی ملی وہ یہی دن تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام کی ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے اسی دن ہوئی، اور حضرت یوسف علیہ السلام تختِ خلافت پر دس محرم ہی کو متمکن ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی دن اپنی قوم سمیت فرعون سے نجات پائی، اور اسی دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، اسی دن حضرت سلیمان علیہ السلام کو آزمائش کے بعد بادشاہت ملی، اور حضرت ایوب علیہ السلام کو بھی بعد امتحان شفا اسی روز ملی، یہی وہ دن ہے جس میں حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیا گیا، اور یہی وہ دن ہے جس میں جگر گوشۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے باطل سے ٹکرا کر جامِ شہادت گلے لگایا، اسی دن اس کائنات کی بساط لپیٹ کر قیامت برپا کردی جائے گی۔

(فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، بحوالہ خصوصیات ماہ محرم الحرام ویوم عاشوراء، ومعارف القرآن [ملخصاً])

اس ماہ میں کرنے کے کام

اس ماہ میں چند کام ہیں جن کو ہمیں انجام دینا ہے: ۱- یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا، ۲- گھر والوں پر خرچ میں توسُّع کرنا، ۳- فرائض کا اہتمام اور نفلی عبادات بکثرت کرنا، ۴- گناہوں سے بچنے کی کوشش کرنا، ۵- اتباعِ سنت کا التزام کرنا۔

اس ماہ میں نہ کرنے کے کام

وہ امور جن سے اس ماہ میں بچنا ہے وہ یہ ہیں: ۱- کالا لباس پہننا اور کالا جھنڈا لگانا، ۲- نحوست اور غم کا مہینہ سمجھنا، ۳- سوگ وتعزیہ اور ماتم کرنا، ۴- شربت وغیرہ کی سبیلیں لگانا، ۵- دیگر من گھڑت رسموں کو اپنانا۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

راستوں کی نظافت وصفائی کی اہمیت
تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں

مولانا عصمت اللہ نظامانی
متخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

اسلام میں صفائی ستھرائی اور نظافت کی بہت اہمیت ہے، انسان کے جسم اور کپڑوں کی پاکی اور ظاہری نظافت ہو، یا قلب وذہن کو برے خیالات سے، زبان کو بدگوئی، نظر کو بدنظری سے بچانا اور باطنی پاکی ہو، ہر قسم کی نظافت اور اس سے متعلق احکام وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں، کیونکہ اسلام ایک دینِ فطرت ہے، انسان کی اُخروی زندگی کے ساتھ دنیوی زندگی کامیاب اور خوش گوار بنانے کے تمام بنیادی احکام بیان کیے ہیں، چنانچہ جس طرح عقائد وعبادات سے متعلق احکامات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اسی طرح معاشرت سمیت دین کے دیگر شعبوں کے احکام بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اور صفائی اور نظافت بھی ان میں سے ایک حکم ہے۔

نظافت و پاکی کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے، اور احادیثِ مبارکہ میں بہت اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ذیل میں اس نظامِ صفائی کے ایک شعبے اور حصے یعنی راستوں کی نظافت وصفائی کی اہمیت تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں اُجاگر کی جارہی ہے، کیونکہ گلی کوچوں اور راستوں کی صفائی ایک صحت مند قوم کی علامت اور ضمانت ہے۔

راستے سے تکلیف دہ اشیاء ہٹانا صدقہ ہے

راستے سے تکلیف دہ چیزیں، جیسے: کانٹے، کانچ اور شیشے کے ٹکڑے، پھلوں کے چھلکے، اور کوڑا کرکٹ وغیرہ جس سے گزرنے والوں کو تکلیف واذیت ہوتی ہو، ایسی تکلیف دہ اشیاء ہٹانا ایمان کا حصہ اور ایک قسم کا صدقہ ہے، چنانچہ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے:

’’ویمیط الأذی عن الطریق صدقۃ.‘‘(۱)

’’یعنی راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے۔‘‘

راستے سے اذیت دینے والی چیز ہٹانے کا نبوی حکم

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل سکھلایئے جس سے میں نفع اٹھاؤں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اعزل الأذى عن طريق المسلمين.''(۲) یعنی ''مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹاؤ۔''

راستے سے کانٹے دار جھاڑی ہٹانے پر مغفرت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ایک آدمی راستے میں چل رہا تھا کہ وہاں کانٹے دار جھاڑی دیکھی تو اسے راستے سے ہٹا دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ عمل قبول کیا اور اسے بخش دیا۔ (۳)

راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا ایک اچھا عمل

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں: مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال پیش کیے گئے، تو تکلیف دینے والی چیز راستے سے ہٹانا اچھے اعمال میں دیکھا تھا، اور برے اعمال میں یہ بھی دیکھا کہ تھوک مسجد میں پھینکی جائے، اور اسے دفن نہ کیا جائے۔ (۴)

راستوں پر گندگی کرنا قابلِ لعنت عمل ہے

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت کا سبب بننے والی دو چیزوں سے بچو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ وہ کون سی دو چیزیں ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کے راستے میں یا کسی (بیٹھنے کی) سایہ دار جگہ میں بول و براز کرنا۔ (۵)

گھر کے سامنے والے حصے کی نظافت کا حکم

بعض لوگ گھر کی صفائی کر کے کچرہ گھر سے باہر گلی میں ڈال دیتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے، اور اسے اس زمانے کے یہود کا فعل کہا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کے سامنے والے حصہ کی صفائی کیا کرو، یہود کی مشابہت اختیار نہ کرو، کیونکہ وہ گھر کے سامنے والے حصے کی صفائی نہیں کرتے۔ (۶)

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ راستوں کی صفائی اور نظافت کا لحاظ نہ رکھنے سے معاشرے میں بہت سی بے اعتدالیاں جنم لیتی ہیں، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، سماج پر ہر اعتبار سے اس کے برے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جسمانی بیماریاں، اعصابی امراض، ذہنی تناؤ اور تھکاوٹ، طبیعت پر بوجھ اور

ان جیسے دیگر امراض کی اہم وجہ اگر گلی کوچوں کی گندگی اور راستوں پر پڑے کوڑے کے ڈھیر وغیرہ کو قرار دیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔اسی وجہ سے حضور ﷺ نے بھی نہایت تفصیل اور وضاحت سے راستوں کی نظافت وصفائی کی اہمیت بیان کی ہے۔

اور اس نظافت کا فائدہ کسی ایک طبقے کو نہیں، بلکہ تمام معاشرے کو ہوگا، ایک طرف انسان جسمانی اور ذہنی اعتبار سے تندرست وصحت مند رہے گا،تو دوسری طرف دیگر اقوام کی نظروں میں ایسے معاشرے کا مقام ومرتبہ بلند ہوگا، لہٰذا ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ راستوں کی نظافت میں اپنا حصہ ڈالے،اور اس کارِ خیر میں عملی طور پر شریک ہو۔

بالخصوص حالیہ دنوں میں جبکہ عیدالاضحیٰ قریب ہے، یہ ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے، ان دنوں قربانی کے جانوروں کی خریداری کے بعد انہیں گلی محلوں اور گھروں میں باندھا اور رکھا جاتا ہے،بعض لوگ جانور تو گلی کوچوں میں باندھ دیتے ہیں،مگر گوبر وغیرہ کی صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھتے ،جس سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے،ایک مسلمان جہاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربانی جیسے عظیم فریضے کی بجا آوری کرکے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی کوشش کررہا ہے، وہاں اسے حقوق العباد کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ راستوں کی صفائی ستھرائی میں غفلت کرکے ایذاءِ مسلم کا سبب نہ بنے ،اسی طرح عید کے دنوں میں جب قربانی کی جائے، جانور ذبح کیا جائے، اس موقع پر بھی جانور کا خون، ہڈیاں، آلائشیں، اوجھڑیاں وغیرہ راستوں میں نہ پھینکی جائیں،تاکہ آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو،ان دنوں میں خاص طور پر صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے۔اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے،آمین۔

حواشی وحوالہ جات

١- صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب من أخذ بالركاب ونحوه، (٥٦/ ٤)، رقم الحديث: ٢٩٨٩، الناشر: دار طوق النجاة، ط:١٤٢٢ھ

٢- صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن الإشارة بالسلاح إلى مسلم، (٢٠٢١/ ٤)، الناشر: دار إحياء التراث العربي، بيروت

٣- سنن الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في إماطة الأذي عن الطريق، (٤٠٥/ ٣)، رقم الحديث:١٩٥٨، الناشر:دار الغرب الإسلامي- بيروت، ط:١٩٩٨م

٤- سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب إماطة الأذى عن الطريق، (١٢١٤/ ٢)، رقم الحديث: ٣٦٨٣، الناشر: دار الفكر، بيروت

٥- صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب النهي عن التخلي في الطرق والظلال، (٢٢٦/ ١)

٦- سنن الترمذي، أبواب الأدب، باب ما جاء في النظافة، (٤٠٩/ ٤)، رقم الحديث: ٢٧٩٩

مسئلہ تقدیر

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ایمان افروز خط

مولوی محمد نعمان خلیل
متعلم تخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

مسئلہ تقدیر کی وضاحت

تقدیر ربِ کائنات کی وہ دستاویز ہے، جس میں کائنات کی ہر چیز کے متعلق مکمل تفصیل موجود ہے، ابتدائے آفرینش سے قیامت تک ہونے والے تمام چھوٹے، بڑے واقعات کی جزئیات لکھی جاچکی ہیں، انسان کی عمر، رزق، رہائش، موت، اس کی سعادت مندی، اور بدبختی کے فیصلے دنیا کے وجود سے پچاس ہزار سال پہلے قلم بند ہوچکے ہیں۔ (۱)

تقدیر رب العالمین کا ایک پوشیدہ راز ہے، جس کی خبر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، یہی وجہ ہے کہ انسان بالخصوص مسلمان کو تقدیر کے معاملہ میں جستجو کرنے، اس کی ٹوہ میں لگنے، اس کے متعلق مناظرے کرنے، اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرنے سے روکا گیا ہے۔ سنن ترمذی میں روایت ہے کہ ایک روز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تقدیر کے مسئلہ میں باہم گفتگو فرما رہے تھے، جو بحث و مباحثہ کی صورت اختیار کرگئی، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت کلفت و ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور اس ناراضگی کا اثر چہرۂ مبارک پر ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے ابھی کسی نے انار نچوڑا ہو، اور فرمایا:

’’أبهٰذا أمرتم، أم بهٰذا أرسلت إليكم؟ إنما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا في هٰذا الأمر.‘‘(۲)

’’کیا تمہیں اسی (بحث و مباحثہ) کا حکم دیا گیا ہے؟ یا میں یہی چیز دے کر بھیجا گیا ہوں؟ یقیناً تم سے پہلی قومیں تقدیر میں جھگڑنے کی وجہ سے ہلاک ہوچکی ہیں۔‘‘

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی شخص نے تقدیر کے بارے میں سوال کیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’طریق مظلم لا تسلکہٗ‘‘یعنی’’یہ اندھیری راہ ہے، اس پر مت چلو۔‘‘

اس شخص نے دوبارہ سوال کیا، تو فرمایا:’’بحرٌ عمیقٌ لا تلجه‘‘یعنی گہرا سمندر ہے، اس میں مت داخل ہو۔ اس نے ایک بار پھر سوال کیا، تو فرمایا:’’سرّ الله قد خفي عليك فلا تفتشه‘‘یعنی اللہ کا راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تجھ سے مخفی رکھا ہے؛ لہٰذا اس کی تفتیش وجستجو میں مت پڑو۔ (۳)

ایک ضعیف روایت میں ہے کہ جس نے تقدیر کے معاملہ میں گفتگو کی (یعنی اس کی جستجو میں لگا) قیامت کے روز اس سے پوچھ ہوگی۔ (۴)

جس طرح شریعتِ مطہرہ میں ایک انسان کو دوسرے انسان کے راز چھپانے کی ترغیب دی گئی ہے، اور اپنے مومن بھائی کے پیچھے لگ کر اس کے رازوں تک رسائی حاصل کرنے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راز کی ٹوہ میں لگنے سے روکا گیا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان سے بلندتر ہے، تو اس کے راز پانے کی دھن میں رہنا کیوں کر روا ہوسکتا ہے؟

تقدیرِ الٰہی پر ایمان

تقدیر پر ایمان لانا مسلمانوں کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ ہے، اور اس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں یہ یقین کر لینا کہ خیر وشر کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، انسان کو جو خوشیاں، اور مصیبتیں ملتی ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ملتی ہیں۔ انسان کے رزق میں کشادگی اور وسعت اسی کے ہاتھ میں ہے، ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ:’’رزق انسان کو ایسے ہی تلاش کرتا ہے، جیسے موت اسے تلاش کرتی ہے۔‘‘(۵)

تقدیرِ خداوندی کے سامنے عقلاء کی عقلیں اور ماہرین کی تدبیریں سب خاک ہیں۔ تقدیر پر ایمان، دلی اطمینان کا باعث، دنیاوی ہموم وغموم کے خاتمہ کا ذریعہ اور پرسکون زندگی کا سبب ہے۔

تقدیر پر تمام انبیاء علیہم السلام ایمان رکھتے تھے، اور اس پر ایمان لانے کی طرف دعوت دیتے چلے آئے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی حیاتِ طیبہ میں تقدیر پر ایمان لانے کو لازم قرار دیا، اور تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس پر ایمان لائے، اور اس عقیدے پر تمام امتِ مسلمہ کا اجماع ہے۔

انکارِ تقدیر کی ابتدا، اور پیشِ نظر خط کا پس منظر

امام مسلمؒ کتاب الایمان کے شروع میں روایت نقل فرماتے ہیں:

’’یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ: سب سے پہلے جس نے تقدیر میں گفتگو کی (بصرے میں) وہ معبد جہنی تھا، میں اور حمید بن عبدالرحمٰن حمیری دونوں حج یا عمرے کے لیے چلے اور ہم نے

کہا: کاش! ہمیں کوئی صحابیِ رسول (رضی اللہ عنہ) مل جائے جس سے ہم اس بات کا ذکر کریں جو یہ لوگ تقدیر کے بارے میں کہتے ہیں۔ ہمیں حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما مسجد میں داخل ہوتے ہوئے مل گئے۔ میں اور میرا ساتھی ان کے داہنے اور بائیں طرف ہو گئے۔ میں سمجھا کہ میرا ساتھی مجھے بات کرنے دے گا، تو میں نے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! ہماری طرف کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم میں باریکیاں بھی نکالتے ہیں (اور ان کا باقی حال بھی بیان کیا) اور یہ بھی بتایا کہ وہ کہتے ہیں کہ: تقدیر کوئی چیز نہیں اور سب کام ناگہاں اور نئے سرے سے ہو رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم جب ایسے لوگوں سے ملو تو کہہ دینا کہ میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے (بری ہیں)۔ اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا رہا ہوں کہ ایسے لوگوں (یعنی تقدیر کے منکرین) میں سے اگر کسی کے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو، پھر وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اللہ قبول نہیں کرے گا جب تک تقدیر پر ایمان نہ لائے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان الخ)

عہدِ رسالت کے بعد خلفائے اربعہؓ کے آخری دور میں اطرافِ مدینہ میں کچھ لوگ تقدیر کا انکار کرنے لگے، اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ فتنہ پروان چڑھتا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت کی روشنی میں مسئلہ تقدیر کو واضح کر کے امت کے سامنے پیش کیا، اور جو تشویش اس فتنہ کی وجہ سے پھیل رہی تھی وہ تھمنا شروع ہو گئی، ایک شخص نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا، جس میں اس مسئلہ کی وضاحت مطلوب تھی، آپؒ نے اس فتنہ کو بدعت قرار دیا، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی اتباع کو اصلِ شریعت قرار دیا، اور اسی کو نجاتِ آخرت کا ذریعہ بتلایا۔

یہ اثر سنن ابی داؤد کی ''کتاب السنۃ'' میں ہے، اور اس مکتوب کی عبارات مشکل شمار کی جاتی ہیں، اس کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے، درمیان میں کچھ تشریحی کلمات کا اضافہ بھی ہے، اور آخر میں سہولت وآسانی کی غرض سے خط سے حاصل ہونے والے فوائد بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ (٦)

خط کا سلیس ترجمہ

''ایک شخص نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کو خط لکھ کر ''تقدیر'' کی بابت سوال کیا! آپؒ نے جواب میں لکھا:

حمد وثناء کے بعد! میں آپ کو (چار چیزوں کی) وصیت کرتا ہوں:

۱: اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

۲: اس ذات کے معاملے میں میانہ روی اختیار کرو (اللہ تعالیٰ کے احکامات میں کمی بیشی مت کرو)۔

۳: اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی پر قائم رہو۔

۴: سنت کے ثابت ہو جانے اور اس کی مشقت سے مستغنی ہونے کے بعد مبتدعین کی بدعتوں سے بچتے رہو۔ (اللہ تعالیٰ نے دین میں نئی باتیں پیدا کرنے کا بوجھ لوگوں کے کندھوں پر نہیں ڈالا، بلکہ اپنے دین کو کامل و مکمل بنایا، تاکہ بعد میں انہیں دین میں کوئی نیا حکم نہ نکالنا پڑے)، لہٰذا تم سنت کی مکمل طور پر پیروی کرتے رہو، کیوں کہ تمہارے لیے (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) اسی میں پناہ ہے۔

بدعت کے خلاف قرآن وسنت میں دلائل موجود ہیں

پھر جان لو! لوگ جو بھی بدعت کرتے ہیں، اس کے خلاف پہلے سے (قرآن وسنت میں) حجت قائم ہو چکی ہے، یا وہ (قرآن وسنت میں) نشانِ عبرت بن چکی ہے؛ کیوں کہ سنت اس ذات نے جاری کی ہے، جو سنت کے خلاف (بدعات) کی غلطی، لغزش، کم فہمی اور اس کی شدت سے واقف ہے۔ (یعنی بدعات میں جو برائیاں اور کوتاہیاں ہیں، اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں پہلے سے جانتے تھے، اسی لیے ان کی برائی کو قرآن وسنت میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے، اب سمجھنے والے کو سمجھنا چاہیے کہ فلاں بدعت کے خلاف فلاں آیتِ قرآنی ہے، اور فلاں بدعت کی ضلالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں حدیث سے عیاں ہے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا راستہ ہی پسندیدہ راستہ ہے

اپنے لیے اسی راستے کو پسند کرو! جسے قوم (حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے اپنے لیے پسند کیا ہے، کیونکہ وہ (عظیم الشان) علم سے آگاہ ہو چکے تھے، اور کامل بصیرت کے ساتھ (بدعتوں اور مُحدَثات) سے رُکے ہوئے تھے، وہ (بعد والوں سے زیادہ) دینی احکامات کے اظہار کی قوت رکھتے تھے، اور اپنی فضیلت اور شرافت کی بنا پر دین کے (فہم کے) زیادہ حق دار تھے، اگر وہ ہدایت ہے جس پر تم ہو، تو گویا تم ان سے بھی سبقت لے گئے (یعنی اگر تمہاری بدعت کو دین سمجھ لیا جائے، اور یہ گمان کیا جائے کہ سلف صالح تو اس سے واقف نہ تھے، نہ انہوں نے اس پر عمل کیا، تو گویا تم دین وتقویٰ کے اعتبار سے ان سے بڑھ کر ہو، اور تمہاری فضیلت ان سے زیادہ ہے، جبکہ یہ بات قرآن وسنت کے خلاف ہے کہ بعد کے لوگ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے فضیلت، اور دین داری میں آگے بڑھ جائیں)۔

سلف صالحین کی دینی تشریحات' امت کے لیے کافی ہیں

سوال: اگر تم یہ کہتے ہو کہ جو چیزیں (بدعات) بعد میں پیدا ہوئیں، وہ تو انہی لوگوں نے پیدا کی ہیں جنہوں نے پہلوں کے راستے سے الگ راہ اختیار کی ہے، اور خود کو ان پر ترجیح دی (یعنی انہوں نے ایسی راہ اختیار کی ہے،جس پر سلف صالحین کا گزر ہی نہیں ہوا، اسی وجہ سے ان مسائل میں ان کی اقتدا کرنا بھی لازم نہیں، کیوں کہ ان کا اتباع تب لازم ہوتا، جب راستہ ایک ہوتا، اور جب راہ الگ ہے،تو ان کی پیروی بھی واجب نہیں، لہٰذا ان محدثات کو اپنانا قابلِ اعتراض نہیں ہونا چاہیے)۔

جواب: (یہ بات بالکل درست نہیں) کیوں کہ وہی (سلف صالحین اسلام میں) سبقت لینے والے ہیں، اور وہ اس دین میں ضرورت کی حد تک گفتگو کر چکے ہیں، اور (بعد میں آنے والوں کے لیے) قابلِ اطمینان معلومات فراہم کر چکے ہیں (یعنی دین کے حوالہ سے ان کے راستہ کے علاوہ دوسری راہ اختیار کرنا ہی غلط ہے)، ان کی احتیاط کے بعد دین میں کسی احتیاط (کمی) کی گنجائش نہیں، اور ان کی تفصیلات سے اوپر کوئی تفصیل بیانِ محتاج نہیں، اور ایک قوم نے سلف صالحین سے زیادہ احتیاط کی تو وہ پستی میں جا پڑی، اور دوسروں نے ان سے زیادہ دین کی تشریح کرنی چاہی، تو وہ غلو میں مبتلا ہو گئے۔اور وہ لوگ (دونوں راہوں یعنی افراط وتفریط) کے درمیان سیدھی ہدایت پر تھے۔

تقدیر کا عقیدہ زمانۂ جاہلیت میں

آپ نے تقدیر کے اقرار کے متعلق پوچھا ہے! یقیناً (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) آپ نے ایک باخبر آدمی سے ہی سوال کیا ہے! لوگوں نے جتنی نئی باتیں گھڑی ہیں، اور جتنی بدعات کو فروغ دیا ہے، ان سب میں تقدیر کے اقرار سے زیادہ واضح، اور ثابت شدہ حکم میرے علم میں نہیں ہے، تقدیر کا ذکر تو زمانۂ جاہلیت میں جہلاء (کے کلام) میں بھی پایا جاتا تھا، وہ اپنی گفتگو اور شعروشاعری میں اس کے متعلق کلام کیا کرتے تھے، اسی کے ذریعہ فوت شدہ افراد واشیاء کے بارے میں خود کو تسلی دیتے تھے۔

عقیدۂ تقدیر کی اسلام میں حیثیت

پھر اسلام نے آ کر اس نظریہ کو مزید پختگی دی (کہ اس عقیدہ کو لازم قرار دیا)، آپ ﷺ نے ایک دو سے زیادہ احادیث میں اس کا ذکر فرمایا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین آپ ﷺ سے سنتے، اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اور آپ ﷺ کے وصال کے بعد اس بارے میں آپس میں گفتگو کرتے تھے، (لیکن) اپنے رب پر یقین رکھتے ہوئے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس بات کو محال گردانتے ہوئے کہ (کائنات میں) کوئی چیز ایسی ہے کہ جس کا علم اللہ تعالیٰ کو نہ ہو، لوحِ محفوظ نے

اسے محفوظ نہ کیا ہو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی تقدیر نہ چل سکتی ہو، ان تمام باتوں (جاہلیت کے شعراء کے کلام، حضور ﷺ کی احادیث، اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے آثار) کے باوجود یہ مسئلہ تقدیر، اللہ تعالیٰ کی محکم کتاب (قرآن پاک) میں موجود ہے، اسی سے انہوں نے لیا ہے، اور اسی کتاب سے یہ عقیدہ سیکھا ہے۔

سلف صالحین آیاتِ قرآنیہ کی صحیح تاویل وتفسیر کا علم رکھتے تھے

اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے (اس بارے میں کوئی) آیت کیوں نازل فرمائی؟ اور یہ کیوں فرمایا؟ (یعنی وہ آیات جن میں اسباب اختیار کرنے کا بیان ہے، وہ تو تقدیر کے منافی ہیں، تو جان لیجیے کہ) ان (صحابہ رضی اللہ عنہم، اور سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ) نے بھی ان آیات کو پڑھا ہے، جن کی تم تلاوت کرتے ہو، (لیکن) وہ اس کی (صحیح) تفسیر کا علم رکھتے تھے جس سے تم ناواقف ہو، ان تمام باتوں کے بعد بھی وہ تقدیر اور لوحِ محفوظ کتاب کے قائل رہے۔

تقدیر پر ایمان لانے کا خلاصہ

بدبختی و بدقسمتی لکھی جا چکی ہے، اور جو مقدر ہو چکا، وہ ہو کر رہے گا، اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے اور جو نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا، اور ہم اپنی ذات کے لیے کسی نقصان کے مالک ہیں، نہ نفع کے، اس کے (ان چیزوں کا علم رکھنے کے) بعد بھی وہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) نیک اعمال میں رغبت رکھتے تھے اور (برے اعمال سے) ڈرتے تھے۔''

مذکورہ مکتوب سے حاصل شدہ فوائد

①- دین کی بنیاد چار چیزوں پر ہے: ❶- اللہ تعالیٰ سے ڈرنا۔ ❷- اللہ تعالیٰ کے احکامات میں معتدل راہ اختیار کرنا۔ ❸- سنت کی پیروی کرنا۔ ❹- بدعت سے بچتے رہنا۔

②- بدعت کے خلاف قرآن وسنت میں دلائل موجود ہیں۔

③- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس مسئلہ میں جو راہ اختیار کی، وہی سب سے بہترین راہ ہے۔

④- سنت کی پیروی میں پناہ اور حفاظت ہے۔

⑤- جس ذات نے شریعت مقرر کی ہے، وہ بدعت کی خرابیوں سے واقف تھی، اسی لیے اس نے اسے دین نہیں بنایا۔

⑥- اگر دین میں نئی چیز پیدا کرنا فضیلت کا کام ہوتا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے علم وفضل، اور

مرتبہ کی وجہ سے اس کے زیادہ مستحق ہوتے۔

⑦-سلف صالحین نے دین کی جو تشریح بیان کی، وہی قابلِ اطمینان ہے۔

⑧-سلف صالحین سے زیادہ دین میں احتیاط برتنا ضلالت، اور ان سے زیادہ پر عمل کرنا غلو ہے۔

⑨- دینی بات اہلِ علم اور اس فن کے ماہر ہی سے دریافت کرنی چاہیے۔

⑩-تقدیر کو ماننے کا نظریہ زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے، عہدِ جاہلیت کے شعراء بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

⑪-تقدیر پر ایمان لانے کا فائدہ یہ ہے کہ گزری ہوئی چیز یا کسی کی جدائیگی کا زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔

⑫- تقدیر پر ایمان لانا دین کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔

⑬- دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں، جس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس لوح محفوظ میں نہ ہو۔

⑭- کائنات کی کوئی چیز قدرتِ خداوندی سے باہر نہیں۔

⑮- تقدیر کا ذکر کتاب اللہ (قرآن مجید، فرقان حمید) میں موجود ہے۔

⑯-جن آیات میں اسباب اختیار کرنے کا حکم ہے، وہ تقدیر پر ایمان لانے کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین (رضی اللہ عنہم) ان آیات کو پڑھتے اور سمجھتے تھے، پھر بھی تقدیر پر ایمان رکھتے تھے، اور اعمالِ صالحہ کو نجات کا ذریعہ گردانتے تھے۔

حواشی وحوالہ جات

١- صحيح مسلم، كتاب القدر، باب حجاج آدم وموسى عليهما السلام، الرقم: ٢٦٥٣، ج:٤ ٢٠٤٤، دار إحياء التراث العربي، بيروت.

٢- سنن الترمذي، أبواب القدر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في التشديد في الخوض في القدر، رقم الحديث: ٢١٣٣، دار الغرب الاسلامي، ١٩٩٨ء.

٣- الشريعة للآجرّيّ، باب ذكر ما تأدى إلينا عن أبي بكر وعمر رضي الله عنهما من ردهما على القدرية، وإنكارهما عليهم، الرق:٤٢٢، ج:٢: ٨٤٤، دار الوطن، ط: الثانية ١٤٢٠ھ

٤-سنن ابن ماجة، باب في القدر، رقم الحديث:٨٤، ٦٢/ ١، دار الرسالة العالمية، ط: الأولى، ١٤٣٠ھ.

٥-صحيح ابن حبان، باب ذكر الأخبار عما يجب على المرء من قلة الجد في طلب رزقه بما لايحل، رقم الحديث:٣٢٣٨، ٣١/ ٨، مؤسسة الرسالة بيروت، ط: الأولى ١٤٠٨ھ.

٦-أبو داود ،سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي (المتوفى: ٢٧٥ھ)، سنن أبي داود، كتاب السنة، باب لزام السنة، رقم الحديث:٤٦١٢، ٢٤/ ٧، دار الرسالة العالمية، الأولى، ١٤٣٠ھ.

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

زمزم

فضیلت، اہمیت اور فوائد

مولوی عظیم اللہ
متعلم دورہ حدیث، جامعہ

دنیا کے اندر پانی کی اور بھی بہت ساری اقسام ہیں، مگر باری تعالیٰ نے ان تمام پر ''زمزم'' کو ایسی فوقیت دی ہے اور ایسی برتری بخشی ہے جو کسی اور پانی کو نہیں بخشی۔ عام پانی کے پینے کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا ہے اور نہ کسی پانی کو برکت کی اُمید سے پیا جاتا ہے، مگر زمزم پینے کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور برکتوں کی اُمید سے پیا جاتا ہے۔ اسی طرح عام پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بارِ گراں سمجھتے ہیں، جبکہ زمزم کو عشق و وارفتگی کے ساتھ شہروں شہروں حجاج کرام اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور یہ درحقیقت سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ منتقل کرتے تھے۔ [۱] گویا حجاج اسے اپنے لیے بہترین تحفہ سمجھتے ہیں، اسی لیے اقبال مرحوم نے کہا تھا:

زائرینِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

زم زم کی تعریف و پس منظر

زمزم یہ اسمِ علم ہے اور یہ اس کنویں کے لیے بولا جاتا ہے جو مکہ مکرمہ میں مسجدِ حرام کے وسطی حصے میں واقع ہے۔ [۲]

لغوی اعتبار سے زم زم کے معنی ہیں: ''رُک جا، رُک جا'' اسی طرح بڑی مقدار کے پانی کو بھی زمزم کہا جاتا ہے۔ [۳] جبکہ حضرت قتیبہؒ کہتے ہیں کہ پانی کی آواز کو بھی زم زم کہتے ہیں۔ [۴]

''معجم البلدان'' اور ''لسان العرب'' وغیرہ میں اس کے اکیس نام اور بھی مذکور ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں: (۱) ھزمة الملك (۲) ھي سقيا الله لإسماعيل (۳) ھزمة جبرئيل

(٤) الشباعة شراب الأبرار اور طيبة وغیرہ، (٥) جبکہ البحر العمیق میں ان اکیس ناموں کے علاوہ تیئیس اور بھی مذکور ہیں، جن میں سے چند یہ ہے: (١) طاھرة، (٢) زمازم، (٣) عاصمة، (٤) سالمة، (٥) صافية، (٦) ظاھرة، (٧) عافية اور مباركةوغیرہ۔

پس منظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بمع اہل وعیال مکہ مکرمہ میں ہجرت کرنے سے قبل یہ جگہ (جہاں آبِ زم زم کا کنواں ہے) ایسی وادی تھی کہ چاروں طرف پہاڑوں کے سوا کچھ نہ تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اس سرزمین میں اپنے حرم اور مرکزِ عبادت ورشد وہدایت کے دوبارہ قیام کا ارادہ فرمایا تو حضرت خلیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے لختِ جگر اور اپنی زوجہ محترمہ کو لے کر اس وادیِ غیر ذی زرع کی طرف ہجرت کر جائیں، حکم کے امتثال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دو افراد پر مشتمل اپنے خاندان کو لا بسایا اور ساتھ لایا ہوا توشہ اور اور حضرت ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر واپس تشریف لے گئے۔ جب زادِ سفر ختم ہوا تو ننھے اسماعیلؑ پیاس کی شدت سے تڑپنے لگے، ماں کی مامتا سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور پانی کی تلاش میں سرگرداں ہوگئیں، صفا کی بلندیوں پر چڑھیں، پانی نہ ملا، پھر اُتریں اور دوسری جانب کچھ اس انداز اور روش سے چلیں کہ مُنّا نظروں سے اوجھل نہ ہو، مروہ کی طرف چلتے ہوئے نشیب میں اسماعیل علیہ السلام آنکھوں سے اوجھل ہوئے تو ہاجرہ علیہا السلام نے اس فاصلہ کو دوڑ کر طے کیا، کل کی وہ ہاجرہ کی دوڑ ہی آج کی سعی ہے۔ مروہ پر چڑھ کر بھی کہیں پانی نہ ملا، بے قراری کی اس حالت میں صفا مروہ پر سات مرتبہ چڑھنا اُترنا ہوا، ساتویں چڑھائی تھی کہ کچھ آواز سنائی دی، آہٹ پر جب نظر گئی، دیکھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس ایک فرشتہ موجود ہے، دوڑ کر آئیں تو جبرائیل امین علیہ السلام نے تسلی کے کلمات ارشاد فرمائے اور پھر اپنا ''پَر'' زمین پر مارا تو ایک چشمہ نمودار ہوا، ایک طرف جگر گوشے کی پیاس کی وجہ سے تڑپنے نے ممتا کا کلیجہ پھاڑ رکھا تھا اور دوسری طرف پانی ملنے کی خوشی نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو فرحت کے وہ فردوس دکھائے کہ بے جان پانی کو مخاطب کیا، گویا اماں بزبانِ حال کہہ رہی تھیں کہ ماں کی ممتا دیکھ کر تو اُبل بڑا، اتنا ترس کھایا، ..... حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے زم زم کہتے ہوئے باڑھ بنائی، پانی جمع کر کے مشکیزہ بھرا اور جی بھر کر اپنے لعل کو بھی پلایا اور خود بھی سیراب ہوئیں۔ (٦)

فضائل وفوائد

زمزم کا پانی ہمیشہ سے محترم ومقدس سمجھا جاتا رہا ہے، اس سے برکت حاصل کرنے کے لیے زائرین نہ صرف اسے پیتے ہیں، بلکہ بطور تبرّک اپنے ساتھ لے کر بھی جاتے ہیں اور تقسیم کرتے ہیں۔

ترمذی شریف میں حضرت عروۃ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق مروی ہے کہ: ’’أنّها کانت تحمل من ماء زمزم وتخبر أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلّم كان يحمله.‘‘(۷) یعنی جب اماں عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ منورہ لوٹتی تھیں تو زمزم ساتھ لے جاتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زمزم ساتھ لے جاتے تھے۔

کعبہ شریفہ چونکہ اہلِ اسلام کا قبلہ ہے، اس لیے حج اور زیارت کے موقع پر یہ ان لوگوں کی ضیافت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ اپنی روحانی برکتوں کے علاوہ آبِ زم زم دنیا کا بہترین پانی ہے جو بھوک اور پیاس میں یکساں مفید ہے، اور اس وادی غیر ذی زرع میں آ بسنے والے ان دو پاکیزہ نفوس کی جو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے مہمان تھے اور زمزم کی نعمت غیر متوقع اور غیر مترقبہ مل گئی تھی، ان کی واحد کفیل تھی، یعنی پیاس میں زمزم سے سیرابی بھی اور بھوک میں زمزم ہی سے سیر شکمی ہوتی تھی۔

مسلم شریف میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمزم کا پانی کھانے کے قائم مقام ہے اور بیماری کی دوا ہے۔(۸)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے احمد بن حنبلؒ بیان کرتے ہیں کہ: زمزم کا پانی جس غرض سے پیا جائے مفید ہے۔(۹) اور امام ابن ماجہؒ نے بھی یہ حدیث عبداللہ بن مؤملؒ کے حوالے سے ذکر کی ہے: ’’ماء زمزم لما شرب له.‘‘(۱۰)

حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کسی آدمی کو کہا کہ جب تو زمزم کا پانی پیے تو کعبہ کی طرف رخ کر کے اللہ کا نام لے کر تین سانسوں میں خوب پیٹ بھر کر پی، بعد ازاں الحمد للہ کہہ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے اور منافقوں کے درمیان امتیازی شان یہ ہے کہ وہ پیٹ بھر کر آبِ زم زم نہیں پیتے۔(۱۱)

سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں کہ جب جناب عبدالمطلب نے زمزم کا کنواں کھودا تو اعلان کیا: ’’لا أحلها لمغتسل، وهي لشارب حلّ و بلّ‘‘ یعنی ’’یا اللہ! میں آبِ زم زم غسل کرنے والوں کے لیے حلال نہیں سمجھتا اور پینے والوں کے لیے مباح ہے۔‘‘(۱۲)

بیماری کے لیے زمزم کا استعمال

حجاج کرام اور معتمرین اسے اپنے ساتھ لاتے، محفوظ کرتے اور بیماریوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ یہ عمل بھی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

’’حمله رسول الله صلى الله عليه وسلّم في الأوادي والقرى وكان يصبّ على المرضى و يستقيم.‘‘(۱۳)

''آپ ﷺ اسے اپنے ساتھ مٹکوں میں لاتے اور آپ ﷺ اسے مریضوں پر ڈالتے اور انہی کو پلاتے تھے۔''

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

''خیر ماء علی وجه الأرض ماء زمزم فیه طعام الطعم وشفاء السقم.''(۱۴)

''روئے زمین پر سب سے بہتر پانی زمزم ہے، اس میں غذائیت اور بیماری کی شفا ہے۔''

ان روایتوں اور ان جیسی اور روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی دوائیوں سے جیسے علاج کرنا مباح اور جائز ہے، زمزم کے ذریعے بھی علاج کرنا صرف مباح نہیں، بلکہ مسنون بھی ہے۔

دنیوی مسائل کے لیے زمزم پینا

زمزم کی افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے ایک اور ارشاد میں فرماتے ہیں:

''مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهٗ إِنْ شَرِبْتَهٗ تَسْتَشْفِيْ بِهٖ شَفَاكَ اللّٰهُ ، وَإِنْ شَرِبْتَهٗ لِشِبَعِكَ أَشْبَعَكَ اللّٰهُ بِهٖ ، وَإِنْ شَرِبْتَهٗ لِيَقْطَعَ ظَمَأَكَ قَطَعَهُ اللّٰهُ ، وَهِيَ هَزَمَةُ جِبْرِيْلَ وَسُقْيَا اللّٰهِ إِسْمَاعِيْلَ.''(۱۵)

یعنی ''زمزم ان تمام مقاصد کے لیے ہے جن کے لیے اسے پیا جاتا ہے، اگر تم اسے شفایابی کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں شفا نصیب کریں گے، اگر اسے شکم سیری کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ شکم سیر کردیں گے، اگر اسے پیاس بجھانے کے لیے پیو گے، اللہ تعالیٰ دور کردیں گے۔ یہ کنواں حضرت جبریل علیہ السلام کا کھودا ہوا ہے، اور یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیرابی کا انتظام ہے۔''

اس حدیث کی روشنی میں فقہاء نے وضاحت فرمائی ہے کہ دنیاوی یا اخروی مسائل کو حل کرنے کے لیے آبِ زم زم پینا مسنون ہے۔

شفاء الغرام میں امام تقی الدین فاسیؒ نے لکھا ہے کہ احمد بن عبداللہ شریفی نابینا ہوگئے تھے، انہوں نے ماءِ زمزم بینائی واپس آجانے کی نیت سے پیا، پس بفضل اللہ آپ کی بینائی لوٹ آئی۔(۱۶)

علامہ ذہبیؒ نے عبداللہ بن مسلم یا ان کے بیٹے احمد بن عبداللہؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک جماعت کے ساتھ حج کے لیے میں گیا، اس جماعت میں ایک فالج زدہ آدمی تھا، میں نے ایک دن دیکھا کہ وہ صحیح سالم ہے اور طواف کررہا ہے اور اس پر فالج کے بالکل آثار نہیں ہیں، پوچھنے پر اس نے بتایا: میں بئر زمزم پر آیا اور زمزم لے کر اپنی دواۃ میں ڈالا اور اس دواۃ کی روشنائی سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے کے بعد سورۂ حشر کی آخری تین آیات لکھیں، اور پھر سورۂ اسراء کی آیت ''وَلَئِنْ شِئْنَا

لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ‘‘ (١٧) لکھی اور پھر میں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی: اے اللہ! آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ’’ماء زمزم لما شرب لهٗ‘‘ اور یہ قرآن آپ کا کلام ہے، پس (اس کی برکت سے) عافیت کے ساتھ مجھے شفا عطا فرمادیجئے۔ اور پھر میں نے اسے آبِ زمزم کے ساتھ گھولا اور پی لیا، پس مجھے عافیت مل گئی اور فالج کے مرض سے باِذنِ اللہ نجات مل گئی۔ (١٨)

ابن قیم رحمہ اللہ اپنا واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں مجھ پر ایسا وقت گزرا کہ میں مریض تھا، نہ طبیب میسر تھا اور نہ دوا موجود تھی، تو میں آبِ زم زم شفا کی نیت سے پیتا تھا اور ’’إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ‘‘ (١٩) پڑھتا تھا، پس مجھے مکمل شفا حاصل ہوگئی۔ (٢٠)

ان روایات، فقہاء اور ائمہ کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ زمزم دنیوی مسائل کے حل کے لیے بھی انتہائی مفید اور مسنون عمل ہے۔

اُخروی مسائل کے لیے زمزم کا پینا

بعض صحابہ کرامؓ اور حضرات ائمۂ اُمت سے اخروی مسائل میں آسانی کے لیے زمزم کا پینا ثابت ہے۔ الجوهر المنظم ص: ٦٢ پر ’’فضل ماء زمزم‘‘ کے تحت لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے زمزم پیا اور یوں کہا: ’’اللّٰهم أشربهٗ لظمأ يوم القيامة‘‘ یعنی ’’میں اسے قیامت کے دن کی پیاس سے بچنے کی نیت سے پی رہا ہوں۔‘‘ (٢١)

اسی طرح عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے منقول ہے کہ وہ زمزم پیتے وقت یہ کہتے کہ: مجھے یہ حدیث ’’ماء زمزم لما شرب لهٗ‘‘ پہنچی ہے۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے اے اللہ! میں اُسے قیامت کی پیاس بجھانے کے لیے پی رہا ہوں۔ (٢٢)

معلوم ہوا زمزم اُمتِ محمدیہ کو خداوندِ قدوس کی طرف سے وہ نعمتِ عظمیٰ اور وہ گوہرِ نایاب دستیاب ہوا ہے کہ دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کے مصائب اور مسائل سے نجات پانے کا نہایت ہی آسان اور سہل راستہ میسر ہوا ہے۔

زمزم پیتے وقت دعا کی قبولیت

دعا کی قبولیت بعض اوقات مکان کے ساتھ (٢٣) جبکہ بعض اوقات زمان کے ساتھ معلق ہوتی ہے، جیسے احادیث میں دو خطبوں کے درمیان (٢٤) اور بعض دوسری احادیث میں عصر اور مغرب کے درمیان کا ذکر ہے، (٢٥) جبکہ کچھ حدیثوں میں اذان (٢٦) اور اقامت کے درمیان دعا کی مقبولیت کا

ذکر بھی آتا ہے۔ (۲۷) اسی طرح زمزم پیتے وقت بھی اگر دعا کی جائے تو اسرع بالقبولیت ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب جب زمزم پیتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے: ’’اللّٰهم إني أسئلك علمًا نافعاً ورزقاً واسعاً وشفاءً من كلّ داء.‘‘ (۲۸)

اسی طرح زمزمی نے ’’نشر الآس‘‘ میں ’’قرة العين‘‘ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس لیے پیا کہ یا اللہ! مجھے أعلم العلماء بنا دیجئے۔ امام صاحبؒ کی یہ دعا قبول ہوئی اور آپ اپنے زمانے کے أعلم العلماء بن گئے، فقہ میں جوان کا مقام ہے وہ اہلِ علم واہلِ حق پر عیاں ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: ’’الناس في الفقه عيال على أبي حنيفة.‘‘ (۲۹) یعنی ’’لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ہیں۔‘‘

اوراسی طرح کا واقعہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ حافظ ابن خزیمہؒ سے پوچھا گیا: آپ کو کہاں سے (اتنا زیادہ) علم حاصل ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے زمزم اس نیت سے پیا کہ اے اللہ! مجھے علم نافع عطا فرما دیجئے۔ (۳۰)

زمزم تقویتِ قلب کے لیے پینا

زمزم کے اندر ذوالجلال نے یہ خاصیت بھی رکھی ہے کہ اس سے دل مضبوط ہو جاتا ہے اور دل کی گھبراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ: رسول کا سینہ چاک کر کے اسے زمزم سے اسی لیے دھویا گیا، تا کہ اس کے اندر آسمان وزمین کے ملکوت اور جنت وجہنم کے دیکھنے کی قوت پیدا ہو جائے۔

زمزم پینے کا طریقہ

زمزم پینے کا طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر تین سانس میں قبلہ رو ہو کر پیا جائے اور خوب اچھی طرح سیراب ہو کر پیا جائے، جیسا کہ حضرت اب عباس رضی اللہ عنہما نے یہ طریقہ ایک شخص کو بتایا تھا: ’’إذا شربت من ماء زمزم، فاستقبل القبلة، واذكر اسم الله، وتنفس ثلاثًا، وتضلع منها، فإذا فرغت، فاحمد الله عز وجل.‘‘ (۳۱) اور زمزم سیراب ہو کر نہ پینے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ’’إن آية ما بيننا و بين المنافقين، إنهم لا يتضلعون من زمزم.‘‘ کہ: ’’ہمارے اور منافقوں کے بارے فرق یہ ہے کہ وہ زمزم پیٹ بھر کر نہیں پیتے۔‘‘ (۳۲)

جہاں تک زمزم کھڑے ہو کر پینے کی بات ہے، جیسا کہ آج کل رواج ہو گیا ہے تو اس سلسلے میں فقہی تصریحات سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مستحب نہیں ہے۔ البتہ عام پانی کی طرح اسے کھڑے کھڑے پینا مکروہ بھی نہیں ہے، بلکہ اسے کھڑے ہو کر پینا بلا کراہت جائز ہے، جیسے کہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

’’ولعل الأوجه عدم الكراهة إن لم نقل بالاستحباب لأن ماء زمزم شفاء وكذا فضل الوضوء.‘‘(۳۳)

خلاصۂ کلام

زمزم کوادب واحترام سے پیا جائے، اس کے اندر پوشیدہ برکات سے استفادہ کیا جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدردانی کرنا اوراس کی حرمت کو پیشِ نظر رکھنا ایمانی فریضہ ہے، اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ ان کاموں میں یہ پانی استعمال نہ کیا جائے جن سے اس کی توہین ہوتی ہے، مثلاً اس سے ناپاکی اور گندگی صاف کرنا یا اس سے استنجاء کرنا وغیرہ مکروہِ تحریمی ہے۔(۳۴)

یہ پانی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا قیمتی تحفہ ہے، ہمیں اس کے اندرودیعت کردہ فوائد سے خودکوقیمتی بنانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم کواس متبرک پانی سے خوب خوب سیراب ہونا نصیب فرمائے، آمین، ثم آمین۔

حوالہ جات

١: صحيح مسلم: ٤/ ١٩١٩، حديث:٢٤٧٣
٢: مشارق الأنوار على صحاح الآثار: ١/ ٣١٥
٣: مشارق الأنوار على صحاح الآثار: ١/ ٣١٥
٤: غريب الحديث لابن قتيبة: ٢/ ٥٠٢
٥: لسان العرب: ١٢/ ٢٧٥
٦: صحيح البخاري: ٤/ ١٤٢
٧: سنن الترمذي، ت: بشار: ٢/ ٢٨٧ حديث: ٩٦٣
٨: صحيح مسلم: ٤/ ١٩١٩، حديث:٢٤٧٣
٩: مسند أحمد مخرجا: ٢٣/ ١٤٠، حديث: ١٤٨٤٩
١٠: سنن ابن ماجة: ٢/ ١٠١٨، حديث: ٣٠٦٢
١١: المستدرك على الصحيحين للحاكم: ١/ ٦٤٥، حديث: ١٧٣٨
١٢: السيرة النبوية لابن كثير: ١/ ١٧٣
١٣: بيهقي، ج: ٥، ص: ٢٠٢
١٤: جمع الفوائد: ١٣٦٨١
١٥: دار قطني، ج: ٢، ص: ٢٨٩
١٦: شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام: ١/ ٣٣٨
١٧: سورة الاسراء، الآية: ٨٦
١٨: سير أعلام النبلاء، ج:١١، ص: ٢١٢
١٩: القرآن الكريم، سورة الفاتحة، الآية: ٥
٢٠: زاد المعاد في هدي خير العباد: ٤/ ١٦٤
٢١: الجوهر المنظم، ص: ٦٢
٢٢: البيهقي في شعب الإيمان، رقم الحديث: ٤١٢٨
٢٣: الحصن الحصين للجزري، ط: عراس، ص: ٦٨
٢٤: سنن أبي داود، ت: الأرنؤوط: ٢/ ٢٨٢، رقم الحديث: ١٠٤٩
٢٥: سنن الترمذي، ت: بشار: ١/ ٦١٩، رقم الحديث: ٤٩١
٢٦: سنن النسائي، رقم الحديث: ٦٦٩، تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة، مكتبة المطبوعات الإسلامية بحلب، ج: ٢، ص:٢٦
٢٧: سنن الترمذي، ت:بشار، باب ماجاء في أن الدعاء لايرد بين الأذان والإقامة، رقم الحديث: ٢١٢، ج:١، ص: ٢٨٨
٢٨: الدارقطني في السنن الكبرى، ج: ٢، ص: ٢٨٨
٢٩: العبر في خبر من غبر: ١/ ١٦٤
٣٠: سير أعلام النبلاء، ط: الحديث: ١١/ ٢٢٨
٣١: مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ٩/ ٤٧
٣٢: سنن ابن ماجة: ٢/ ١٠١٧
٣٣: شامي، ج: ١، ص: ٨٨
٣٤: شامي، ج: ٢، ص: ٢٨٦

حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف ہالیجوی رحمۃ اللہ علیہ

چند اوصاف وملفوظات

مولوی نظام الدین
متعلم درجہ سادسہ، جامعہ

علماء کرام اور طلباء عظام کا خاص وصف رہا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ ومشائخ سے محبت کی بنا پر ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک بات محفوظ کرتے رہتے ہیں کہ خود بھی اس پر عمل کریں اور بعد میں آنے والوں کو بھی اپنے اکابر ومشائخ کی زندگیوں سے باخبر کریں، چنانچہ ان کی وفات کے بعد کوئی تو ان کے اوصاف، کوئی سوانح اور کوئی ملفوظات لکھتا ہے، اس عادت کی تائید حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے کہ: ''اذکروا محاسن موتاکم''۔ بندہ نے بھی اس نیت سے استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی عبد الرؤف ہالیجوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ اوصاف وملفوظات لکھے ہیں۔

استاذ جیؒ کے اوصافِ حمیدہ پر ایک طائرانہ نظر

❶ -تواضع - حضرت استاذ جیؒ بہت متواضع اور منکسر المزاج تھے، آپ کو عجز وانکساری کا وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ شہرت نام ونمود سے سخت نفرت تھی۔ اپنے شیخ حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ مقتدا اور مرجع وماویٰ ہونے کا کبھی کوئی تأثر نہیں دیا، مخدوم ومحبوب بننے کی کوئی شعوری کوشش رکھی اور نہ کوئی خواہش رکھی۔

تواضع کا طریقہ سیکھ لو لوگو صراحی سے
کہ فیض جاری بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

❷ - زہد وقناعت - استاذ جیؒ کی ابتدائی زندگی مصیبتوں اور مشقتوں سے عبارت تھی، عسرت اور تنگی کا زمانہ تھا، فاقوں پر صبر کرتے ہوئے عمر کا اکثر حصہ مالی تنگی کے ساتھ گزارا، لیکن ''اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ

یُسْرًا ‘‘ کے مصداق اللہ تعالیٰ نے بعد میں وسعت اور فراخی عطا فرمائی، لیکن استاذ جیؒ نہ صرف ہر حال میں شکر گزار رہے، بلکہ اپنی مالی وسعت کے دور میں بھی زہد وقناعت کے دامن کو تھامے رکھا اور دنیا کو اپنے لیے قید خانہ سمجھتے ہوئے سیدھی سادی فقیرانہ اور عیش وعشرت سے خالی زندگی گزاری۔

❸ - **دروس کا اہتمام** - انسان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جو کام بھی کرے اور جو کام اس کے ذمہ ہو اس کو پورا کرے اور اہتمام سے کرے، اہتمام اور مواظبت سے اسباق پڑھانا اکابر ومشائخ کا خاص وصف رہا ہے، یہ وصف استاذ جی میں بدرجہ اتم موجود تھا، سبق کا ناغہ بالکل نہیں کرتے تھے، الا یہ کہ سخت بیمار ہوں۔

❹ - **کامیاب تدریس** - مقبول استاذ و مدرس کی تعریف میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکلوں میں سمجھا دے اور طلباء کرام اس کے درس سے اُکتاہٹ محسوس نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے استاذ جی کو تفہیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان اور اسلوبِ اظہار کی ایسی دلنشیں ودلکش ادا سے نوازا تھا کہ گھنٹوں ان کے درس میں بیٹھے رہنے سے اکتاہٹ بالکل محسوس نہیں ہوتی تھی، اول تا آخر درس پر تازگی اور نشاط ورعنائی چھائی رہتی تھی، چند درسی خصوصیات ملاحظہ ہوں:

① - اسباق کو بہت ہی عام فہم اور دلنشیں انداز میں طلباء کو ذہن نشیں کراتے تھے۔

② - غیر ضروری مباحث وتفاصیل سے اجتناب فرماتے تھے۔

③ - اسباق کی رفتار میں تناسب اور اعتدال ملحوظ رہتا تھا، کتاب کے اول سے آخر تک یکساں رفتار رہتی تھی۔

④ - مشکل عبارتوں کی نہایت معنی خیز اور بامحاورہ تشریح کرتے تھے۔

⑤ - ہر طالب علم کے سوال کا جواب دیا کرتے تھے۔

⑥ - سبق کو سمجھانے کے لیے مثال دینے میں دورِ حاضر کی مثالوں کو مدِنظر رکھتے تھے، دورِ حاضر کی شخصیات کی مثالیں دے کر طلباء کرام میں علم کا جذبہ اُبھارنے کی کوشش کرتے تھے۔

چند علمی افادات

① - فرمایا کہ حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کو باقی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر ثرید کے ساتھ مشابہت دی ہے کہ جیسے ثرید باقی تمام کھانوں پر فضیلت رکھتا ہے، اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو باقی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر فضیلت حاصل ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک بات

سمجھیں، وہ یہ ہے کہ انسان کو دو قسم کی غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے: ایک روحانی غذا کی اور ایک جسمانی غذا کی، جسمانی غذاؤں میں ثرید سب پر فائق ہے اور روحانی غذا تعلیم و تعلم ہے تو حدیث مبارکہ میں اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ امی جان رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے زیادہ تعلیم و تعلم کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

②-فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درازگوش (گدھے) پر سواری فرمائی تو اس حدیث سے مقصود یہ بتلانا نہیں کہ درازگوش پر سواری مسنون ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول مبارک صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ سواری پر بھی سواری کی ہے تو اس کو معیوب نہیں سمجھنا چاہیے، حضرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تین قسم کی سواریاں ہوتی تھیں: اعلیٰ یعنی گھوڑا، متوسط یعنی اونٹ، ادنیٰ یعنی درازگوش۔

③-فرمایا کہ یہ جو حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کا پانی کھڑے ہوکر پی لیا تو اس میں علماء کرام فرماتے ہیں کہ نیچے کیچڑ تھی، اس کی وجہ سے کھڑے ہوکر پانی پی لیا، تو یہ تاویلات ہیں، دراصل بات یہ ہے کہ مطلقاً پانی پینے میں حکم یہ ہے کہ بیٹھ کر پیا جائے، اس کی حکمت یہ ہے کہ کھڑے ہوکر پانی پینے سے پیاس صحیح نہیں بجھتی اور زیادہ پانی پینا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے پیشاب زیادہ آتا ہے تو تقاضے کے لیے بار بار جانا پسندیدہ نہیں، اس لیے حکم ہے کہ بیٹھ کر پانی پیو، جبکہ زمزم کو کھڑے ہوکر حضرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے پیا کہ کھڑے ہوکر پانی زیادہ پیا جاتا ہے، تو زمزم خالص شفا ہی شفا ہے تو اس کو جتنا زیادہ ہوسکے پی لیا جائے۔

ملفوظات

①- جو کوئی کسی گناہ پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کو صرف خوفِ خدا کی وجہ سے چھوڑ دے تو ایک سال تک عبادت کی لذت محسوس کرے گا۔

②- دین کے جامہ میں چور نہ بنو (یعنی دین کو لوگوں کے اموال کھانے کا ذریعہ مت بناؤ) اس سے بہتر ہے کہ ایک عام چور بن جاؤ۔

③- اگر آج کل یعنی ٹیکنالوجی کے ترقی کے دور میں بھی کوئی اسلام پر اعتراضات کرے تو یہ اس کے دنیوی علوم سے بھی جاہل ہونے کی دلیل ہے۔

④- ہم میں اور ہمارے اکابر کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہمارے اکابر نمازِ عشاء کے بعد فوراً سوجاتے تھے اور پھر رات کے آخری حصہ میں اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کرتے تھے، جبکہ ہم نمازِ عشاء

کے بعد فضولیات اور دعوتوں میں لگ جاتے ہیں اور جب رحمتِ خاصہ یعنی رات کے آخری حصہ کا وقت آجاتا ہے تو ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔

۵- دنیادار بن کر دنیا کماؤ تو تم معزز رہو گے، لیکن دیندار بن کر دنیا نہ کماؤ، یعنی دین کے نام پر دنیا مت کماؤ، ورنہ ذلیل ہوجاؤ گے، ذلیل ہوجاؤ گے (دو مرتبہ یہ آخری جملہ فرمایا)۔

۶- میں طلباء کرام کو صرف یہی نصیحت کرتا ہوں کہ ہماری پگڑیوں اور مدرسہ کی لاج رکھنا، کیونکہ اگر تم نے معاشرہ میں نامناسب حرکات کیں تو لوگ تمہارے اساتذہ اور مدرسہ کو برا بھلا کہیں گے۔

۷- عمل بہت بڑا مبلغ ہے، زبان اتنی بڑی مبلغ نہیں، لہٰذا اعمال اچھے کرو، لوگ تمہیں دیکھ کر سنور جائیں گے۔

۸- جس نے تدریس کرنی ہے اس نے تقریبات اور اپنے پرایوں کی دعوتیں چھوڑنی ہوں گی۔

۹- آدمی اپنی ضروریات کو کم کرے، اس سے آدمی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے۔

۱۰- انسان اگر چاہے کہ اللہ میرے گناہ معاف کرے اور رحمت وشفقت کا معاملہ فرمائے تو اپنے ماتحت کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، اگر ماتحت پر سختی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے قوانین چلائیں گے۔

۱۱- بندہ جتنے کم پر اللہ سے راضی ہو، اللہ بھی اس کے تھوڑے سے عمل پر راضی ہوگا۔

۱۲- آٹھ سال صرف پڑھائی کرو، چھٹیوں میں بھی کوئی اور کام نہ کرو، فاضل ہونے کے بعد جس میدان میں بھی جاؤ گے تو کامیاب رہو گے، آٹھ سال میں اپنے مقصد یعنی پڑھائی سے نہ نکلو، تبلیغ والے پوری دنیا پر چھا گئے صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے مقصد چھ نمبر سے نہیں نکلتے، چاہے جو بھی ہوجائے۔

۱۳- مدرس اگر بننا ہو تو اگر آپ کے اندر شرح جامی پڑھانے کی اہلیت ہے تو ہدایۃ النحو پڑھاؤ اور اگر ہدایۃ النحو پڑھانے کی اہلیت ہو تو نحو میر پڑھاؤ۔

۱۴- بڑے بننے کے لیے چور جتنا عزم بھی کرو تو بھی بڑے بن جاؤ گے کہ جو کچھ ہونا ہے، لیکن میں نے یہ کرنا ہے۔ چور جب چوری کرتا ہے تو یہ عزم کرتا ہے، جو کچھ ہونا ہے ہوجائے، لیکن میں نے چوری کرنی ہے۔

۱۵- مسجد میں عوام کے سامنے نازک اور باریک مسئلے مت چھیڑا کرو، جو لوگ تمہارے سامنے بیٹھے ہیں ان کے مطابق بات کرو۔

۱۶- علماء کے لیے اس وقت سب سے اہم کام کرنے کا یہ ہے کہ اپنے مدارس کو مضبوط کریں، مدارس مضبوط ہوجائیں تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

حضرت مولانا حسن الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مربی ومخدوم کا سایہ اُٹھ گیا

قاری تنویر احمد شریفی
خطیب جامع مسجد سٹی اسٹیشن، کراچی

۱۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ/ ۶؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات سحری کرکے فجر کی نماز کے لیے وضو کرکے مسجد جانے کی تیاری میں میرے انتہائی اور ہردل عزیز استاذ محترم حضرت مولانا حسن الرحمٰن عبداللہ صاحبؒ دل کا دورہ پڑنے سے وصال فرما گئے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون!

حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہٗ کی وفات کی خبر مجھے دن نو بجے کے بعد ہوئی، جو اتنی اچانک تھی کہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا اور یہ محسوس ہوا کہ اپنے جدِامجد حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد یہ دوسرا موقع ہے کہ مربی ومخدوم کا سایہ اُٹھتا ہوا لگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ دنیا میں جس نے قدم رکھا ہے، اس نے ہرحال میں جانا ہے۔ اسی کے تحت ہمارے بڑے گئے اور ایک دن ہم بھی چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آخری وقت میں اپنی رضا وخوش نودی اور ایمان کی سلامتی نصیب فرماکر بلائے۔ آمین!

حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہٗ کی پیدائش چھترپلین ضلع مانسہرہ میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ پندرہ سال کے تھے کہ ۱۹۶۳ء میں کراچی لاکر مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن (حال: جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن) میں درجہ حفظ میں داخل کردیے گئے۔ حفظ قرآن مجید کے بعد شوال المکرم ۱۳۸۶ھ/ جنوری ۱۹۶۷ء میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ (حال: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن) ہی میں درسِ نظامی میں داخل ہوگئے اور یہیں سے شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ/ اگست ۱۹۷۵ء میں دورہ حدیث شریف پڑھ کر

فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت الاستاذؒ کے اساتذہ کرام میں سب اعلیٰ پائے کے جبالِ علم تھے، جن میں محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری، نمونۂ اسلاف حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹونکی، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہ، حضرت مولانا بدیع الزمان، امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن، حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید علیہم الرحمہ شامل تھے۔ حضرت بنوری علیہ الرحمہ سے تلمذ کو آپؒ بہت بڑی نعمت قرار دیتے تھے، اور کیوں نہ ہو؟ حضرت بنوریؒ محدثِ کبیر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔

اساتذہ میں سے جو تعلق اور احترام کے اندر بے تکلفانہ تعلق حضرتؒ کو حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ سے تھا، وہ مثالی تھا، آپؒ نے اپنے استاذِ گرامی کے عقدِ مسنون کو دیکھا تھا۔ اسے آپؒ کے اپنے الفاظ میں پڑھیے!

> ''۱۹۶۴ء میں حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ کے عقدِ مسنون کی تاریخی تقریب بھی آج تک یاد ہے، کم عمری سے دماغ میں نقش اس مجلس کی رونق محفوظ ہے۔ اتنا معلوم ہوا تھا کہ محدث العصر حضرت بنوریؒ کی صاحب زادی کا نکاح ہے، ہم بھی مسجد (بنوری ٹاؤن) میں دور دور سے وہ حسین منظر دیکھ رہے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے والد گرامی محدثِ کبیر حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ سمیت کافی نامور علمی ہستیاں اس تقریب میں جلوہ افروز تھیں۔ نکاح حضرت بنوریؒ نے خود پڑھایا۔ اس میں جو مشائخ تھے، میں نے ان کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا، اور کافی ایسے بھی تھے جن کی زیارت سے بعد میں محرومی رہی، اور وقت کے ساتھ ساتھ ان شخصیات کے بارے میں بہت پڑھا اور سنا، لیکن اپنی زندگی میں اتنے بڑے بزرگوں کو ایک ساتھ شاید پھر کبھی نہیں دیکھا۔''
> (بینات کا امام اہلِ سنت نمبر، ص:۴۷۶)

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ آپؒ پر مکمل اعتماد فرماتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں حضرت مفتی صاحبؒ کی جگہ ریاض مسجد (دہلی مرکنٹائل سوسائٹی) میں ان کے سفر کے دوران نمازیں پڑھاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ عجیب انداز سے حکم فرماتے تھے، جس کی لذت آج تک کانوں میں اس طرح گھومتی ہے: ''میاں! مسجد میں جا کر نماز پڑھاؤ۔''

حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہ صاحبؒ نے آپؒ کو دورے کے سالانہ امتحان کے آخری پرچے کے بعد بلایا اور فرمایا: ''میں گھر والوں کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں جا رہا ہوں، تم میری واپسی

تک میری جگہ امامت کراؤ۔‘‘ چناں چہ آپؒ اپنے استاذ گرامی کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ اسی دوران جامع مسجد شرف آباد سوسائٹی کی کمیٹی نے مسجد میں بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے آپؒ کا تقرر کیا، اس میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ کی مشاورت اور اعتماد شامل تھا۔ چند ہی دنوں بعد حضرت مولانا سید مصباح اللہ صاحب واپس تشریف لے آئے اور ادھر شرف آباد کی مسجد کمیٹی نے آپؒ کو تدریس کے ساتھ امامت وخطابت کی ذمے داری بھی دے دی۔ یہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ/ ستمبر ۱۹۷۵ کا سن تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے آپؒ کے والہانہ وعاشقانہ اور بے تکلفانہ تعلق پر ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

’’بہرحال اسی سال ۱۹۷۵ سے لے کر ۱۹۷۷ء تک میرا روزانہ کا تقریباً معمول رہا، میں شام کو اور بعض مرتبہ عشاء کی نماز پڑھا کر سوسائٹی حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ کیا ہی خوب اور حسین زندگی کے وہ دن تھے۔ بعض مرتبہ حضرت مفتی صاحبؒ میرے ساتھ وہاں سے پیدل بہادر آباد تک آجاتے تھے، اور ہم وہاں آئس کریم وغیرہ کھاتے، اور پھر حضرت مفتی صاحبؒ میرے اصرار کے باوجود اکیلے وہاں سے واپس چلے جاتے اور میں اپنی جگہ پہنچ جاتا۔‘‘ (بینات نمبر، ص: ۴۷۸)

آپؒ کی بیعت کا تعلق رائے پوری سلسلے کے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تھا۔ ان کی وفات کے بعد ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء کے حج کے موقع پر استاذی حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ سے بیعت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد بھی خواہش تھی سیدی ومرشدی حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی مدظلہم (صدر المدرسین دار العلوم دیوبند وصدر جمعیت علمائے ہند) سے بیعت ہوں، لیکن اس کی کوئی سبیل نہیں ہوئی۔ حضرت مولانا ایوب الرحمٰن صاحب انوریؒ نے از خود آپؒ کو خلافت سے نوازا تھا۔ یہ ۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ/ ۶ / اگست ۲۰۰۴ء کا دن تھا۔ آپؒ نے اس خلافت کو مخفی رکھا۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ حضرت! اس سلسلے کو بڑھایئے اور مدرسے میں اصلاحی مجالس قائم فرمایئے، ہمیشہ فرمایا: ’’میاں! یہ بڑے لوگوں کا کام ہے، ہم جیسے کا نہیں۔‘‘

حضرت بنوری قدس سرہٗ نے ایک زمانے میں ایک تجارتی مکتبہ ’’مکتبہ اسلامیہ‘‘ قائم کیا تھا، جو مسافر خانہ عیدگاہ پر تھا۔ اس سے کئی قیمتی کتابیں حضرت بنوریؒ نے شائع کرائی تھیں، جن میں افضل المفسرین شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور پروفیسر انوار الحسن صاحب شیرکوٹیؒ کی کتابیں سرِفہرست تھیں، لیکن مکتبہ کے لیے پوری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، بالآخر وہ بند ہوگیا، لیکن حضرتؒ کی

خواہش رہی کہ کوئی ایسا مکتبہ ہو، جو اپنے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی قلمی خدمات کی اشاعت کرے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس خواہش کی تکمیل آپؒ سے کرائی۔ یہ ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے جو سڑک طیبہ مسجد کی طرف جاتی ہے، اس سڑک پر بائیں ہاتھ پر دوسری دکان ''مکتبہ بنوریہ'' کے نام سے آپؒ نے قائم فرمائی۔ اس زمانے میں جامعہ کے اردگرد کتابوں کی مارکیٹ نہیں تھی۔ مکتبہ بنوریہ میں دو استاذ اور ایک شاگرد (کل تین) شریک تھے: استاذوں میں حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید صاحبؒ اور شاگرد رشید حضرت مولانا حسن الرحمٰن صاحبؒ!

مکتبہ بنوریہ میں آپؒ شرف آباد مسجد کے مدرسے سے پڑھا کر تشریف لے جاتے تھے، اور خود دکان کھول کر بیٹھتے تھے، نمازوں کے اوقات میں دکان بند کرکے شرف آباد تشریف لاتے اور نمازیں پڑھاتے۔ اس وقت آپؒ ففٹی موٹر سائیکل چلاتے تھے۔ مکتبے کے لیے کتابیں دیگر اداروں سے خریدنی ہوتیں تو آپؒ خود موٹر سائیکل پر مارکیٹ تشریف لے جاتے تھے۔ میرا ابھی بچپن اور حفظِ قرآن مجید کا زمانہ تھا، اس وقت حضرتؒ کو اپنے ''مکتبہ رشیدیہ'' میں کتابیں لینے آنا اور خریداری کرنا مجھے یاد ہے۔

آپؒ نے مکتبہ بنوریہ کی ترقی کے لیے آرام وراحت کو قربان کرکے دن رات کو ایک کر دیا تھا۔ اس مکتبے سے آپؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی راہنمائی اور سرپرستی میں کیسی کیسی قیمتی کتابیں شائع کی تھیں؟ ان پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے:

① - معارف السنن (عربی) پانچ جلد میں - حضرت بنوریؒ کی جامع ترمذی کی شرح، اس کے لیے آپؒ نے لاہور کا سفر کیا اور کئی دن وہاں رہ کر اسے چھپوایا اور وہیں سے جلدیں بنوا کر کراچی لائے۔ اس سفر میں حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم (حال استاذ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور) اور استاذی حضرت نفیس شاہ صاحبؒ سے آپؒ کی خوب ملاقاتیں رہیں۔

② - مجرباتِ بنوریہ - حضرت بنوریؒ اور ان کے والد گرامی حضرت مولانا زکریا صاحب بنوریؒ کے طبی مجربات، جو حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ نے مرتب فرمائے تھے، اب یہ کتاب مکتبہ بینات نے چھاپ دی ہے۔

③ - بصائر وعبر - حضرت بنوریؒ نے ماہ نامہ بینات میں جو اداریے تحریر فرمائے، انہیں حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ نے مرتب فرما دیا تھا، یہ دو جلدوں میں چھپی تھی، یہ بھی اب مکتبہ بینات سے دو مرتبہ چھپ گئی ہے۔

④ - نقشِ دوام - حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے مکمل حالاتِ زندگی جو اُن کے صاحبزادے حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ نے لکھے ہیں۔ آپؒ جب دار العلوم دیوبند کے صد

سالہ اجلاس میں گئے تھے، تو یہ کتاب لائے تھے، اس کے عکس لے کر یہاں شائع کیا تھا۔

⑤ -القصائد البنوریة (عربی)

⑥ -المقدمات البنوریة (عربی) وغیرہم!

آپؒ کی جب جامعہ یوسفیہ بنوریہ کے کاموں میں مصروفیت بڑھی تو مکتبہ بنوریہ میں اپنے سے چھوٹے بھائی جناب سیف الرحمٰن صاحب عرف پھلوان بھائی زیدمجدہم کو بٹھایا، اور ایک عرصے تک وہ مکتبہ سنبھالتے رہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ مکتبے کے حصے جس جس کے تھے، انہیں دے کر ختم کر دیا گیا۔ آپؒ کو اپنے بزرگوں کی قلمی خدمات کی اشاعت کا جذبۂ صادق حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ سے ملا تھا۔ آپ نے شرف آباد میں ایک اشاعتی ادارہ بنایا، جو''ادارہ دعوتِ اسلام'' کے نام سے تھا۔ جب تک آپؒ کی صحت اچھی رہی، اس وقت تک اس سے بھی بہت ہی عمدہ کتابیں شائع ہوئیں، اور اب بھی اس ادارے کو زندہ رکھنے کا جذبہ تھا۔ ''ادارہ دعوتِ اسلام'' سے جو کتب شائع ہوئیں، ان کے جو نام ذہن میں ہیں، وہ یہ ہیں:

① -مراصد النظر (عربی) - (حضرت مولانا نورالہدیٰ صاحبؒ) ۲ جلد

② -المغرب (عربی) -فقہی لغت

③ -غیرمقلدین کیا ہیں؟ (دوجلدیں) - سیدی امیرالہند فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ (صدر جمعیت علماء ہند) نے جو رسائل شائع کرائے تھے، انہیں راقم نے مرتب کیا تھا۔ اس کی اشاعت میں دو ادارے شریک تھے، ایک ادارہ دعوتِ اسلام اور دوسرا مکتبہ اسعدیہ!

④ - ملفوظات کشمیری - حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے ملفوظاتِ مبارکہ، مرتب: حضرت مولانا احمد رضا صاحب بجنوریؒ

⑤ - حدود واختلاف - مرتبہ: حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ

⑥ - اسلام کا مکمل نظام طلاق - مرتبہ: مولانا عبدالجلیل صاحب

⑦ -بہشتی گوہر - (حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

⑧ - اشرف الجواب - (حکیم الامت حضرت تھانویؒ) اس کتاب کی اشاعت مکتبہ اسعدیہ اور ادارہ دعوتِ اسلام نے مل کر کی تھی۔

آپؒ نے یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں شائع کی تھی، جون ۲۰۰۴ء میں آپؒ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی خواب میں زیارت کی، دیکھا کہ حضرتؒ وضو کر رہے ہیں اور سرخ چمڑے کا جوتا رکھا ہوا ہے، اس کے اندر مٹی ہے، وضو کے بعد حضرتؒ نے امام صاحبؒ کو کپڑا دینا

چاہا کہ جوتا صاف ہوجائے، آپؒ نے اپنی جیب سے کپڑا نکال کر جوتا صاف کردیا۔ تعبیر اس کی یہ دی گئی تھی کہ اشرف الجواب کی اشاعت سے حضرت حکیم الامتؒ کی روح کو خوشی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ وہ حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحبؒ کے فتاویٰ رحیمیہ کی اجازت ملی تھی، آپؒ نے اس کو فقہی ابواب پر استاذی حضرت مولانا ہارون الرشید صاحب ارشدؒ سے مرتب کرالیا تھا، کتابت کے بعد بہت سے فارم چھپ بھی گئے تھے، لیکن طباعت مکمل ہونا مقدر نہ تھی، وہ فارم طبع شدہ ضائع ہو گئے، اس کا سرورق کاتب الحروف نے کتابت کیا تھا، اسی طرح جناب فیروز احمد صاحب شمسیؒ کا ادارہ ’’شمسی پبلشنگ ہاؤس‘‘ قائم کرانے میں آپؒ کا حکم شامل تھا۔

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ کی سرپرستی میں شرف آباد کراچی میں مدرسہ یوسفیہ بنوریہ ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۲ء میں آپؒ نے قائم فرمایا، جو بعد میں جامعہ کی شکل اختیار کرگیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس مدرسے کے بڑے سرپرست ہی نہ تھے، بلکہ حقیقی سرپرست اور روحِ رواں تھے۔ جامعہ علومِ اسلامیہ کے اہتمام وتدریس میں سے جب وقت نکلتا، جامعہ یوسفیہ بنوریہ تشریف لے آتے، بعض مرتبہ دن میں دومرتبہ بھی آئے۔ مدرسے آکر یہاں کے امور کا جائزہ بھی لیتے اور نہایت قیمتی مشوروں سے نوازتے، اس میں حفظ وناظرے کے ساتھ درسِ نظامی کے اسباق بھی شروع ہوئے۔ ابتدا میں کتابوں کے ایک ہی استاذ تھے، وہ مبارک شخصیت حضرت مولانا ہارون الرشید صاحب ارشد (نور اللہ مرقدہٗ) کی تھی۔

مدرسہ یوسفیہ بنوریہ کا سب سے نااہل طالب علم یہ کاتب الحروف بھی رہا ہے، میرا داخلہ چھٹی کے دن (جمعہ) کو بعد العصر مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود کیا تھا اور ۳۰/شوال المکرم ۱۴۰۷ھ/ ۲۷/جون ۱۹۸۷ء سے تعلیم شروع ہوگئی تھی۔ کاتب الحروف سے آپؒ بہت ہی شفقت اور محبت فرماتے تھے، اس کی دھیمی سی یادداشت ذہن میں آرہی ہے، چاہتا ہوں ذہن سے کاغذ پر منتقل کردوں۔ مدرسے میں داخلہ کے بعد آپؒ کا پہلے ہی دن سے یہ حکم تھا کہ ظہر کی نماز کے بعد ان کے گھر آکر دوپہر کا کھانا کھایا کروں۔ آپؒ موجود ہوں یا نہ ہوں، کھانا وہیں کھانا ہوتا تھا، یہ سلسلہ آٹھ سال رہا۔ کاتب الحروف آپؒ کے گھر کا نمک کھایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی لاج رکھنے کی توفیق دے۔

آپؒ کاتب الحروف کے زمانۂ طالب علمی میں بھی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں رائے لیا کرتے تھے، حالانکہ آپ تجربہ کار تھے، اور پھر میری رائے کس معنی کی تھی؟ یہ صرف آپؒ کی چھوٹوں کی حوصلہ افزائی تھی، جس کا جذبہ ان میں بہت تھا کہ چھوٹا کچھ بن جائے۔

آپؒ بنین میں کوئی کتاب نہیں پڑھاتے تھے، بنات میں پڑھاتے تھے، لیکن دوسال تک

بنین میں ترجمۂ قرآن مجید پڑھایا، خوش قسمتی کہ وہ ہماری کلاس تھی۔ اس طرح سورۂ فاتحہ سے عنکبوت تک ترجمہ آپؒ نے ہمیں پڑھایا۔ آپؒ کا سبق بڑا ہی عجیب اور کارآمد ہوتا تھا۔ ہماری کوتاہیوں کی اس میں اصلاح ہوتی تھی، کتنی ہی چیزوں کی اصلاح ہوئی، یہ سب آپؒ کے لیے یقیناً صدقہ جاریہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی شایانِ شان اس کا اجر عطا فرمائے، آمین!

۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء کے حج میں بھی آپؒ کی بعض جگہ معیت رہی۔ حج کے موقع پر میرے جد امجد حضرت قاری صاحبؒ فرماتے: ''جاؤ! امام صاحبؒ کے پاس ہو کر آؤ۔'' آپؒ نہایت کھلے دل کے تھے۔ اپنے آپ سے شاگرد کو بھی بے تکلف فرمالیا کرتے تھے۔ آپؒ کے پاس دینے والا ہاتھ تھا، کچھ نہ کچھ عطا فرماتے رہتے تھے، محبت اتنی فرماتے تھے کہ اپنے شاگردوں سے ان کی اولاد کی خبر خیریت بھی دریافت فرماتے تھے۔

ہم نے آپؒ کے دستر خوان پر وقت کے بڑے بڑے علماء کو دیکھا ہے، جس میں حضرت مولانا مفتی جمیل خان صاحبؒ، حضرت مولانا اسفندیار خان صاحبؒ، حضرت مولانا نور الہدیٰ صاحبؒ، استاذ محترم حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ، حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحبؒ، مولانا اقبال اللہ صاحب، مولانا فضل محمد صاحب وغیرہ۔ ہائے! اب ہم استاذ محترم کو کہاں ڈھونڈیں گے؟

اللہ تعالیٰ آپؒ کے اس باغ کو قیامت کی صبح تک آب وتاب سے رکھے، آمین!

آپؒ نے حجازِ مقدس کے کئی سفر فرمائے، اور تقریباً ہر سفر میں کسی نہ کسی منزل پر اپنے محبوب استاذ گرامی حضرت مولانا احمد الرحمٰن صاحبؒ کی معیت نصیب میں رہی۔ جس وقت نمازِ جنازہ کے بعد میت قبرستان لے جانے کے لیے اٹھائی گئی، جس دروازے سے باہر آئی تو مجھے وہ منظر یاد آ گیا کہ اسی دروازے سے حج بیت اللہ کے لیے روانگی کے وقت آپؒ احرام باندھے ہوئے نیچے نگاہ رکھے ہوئے اپنے تلامذہ اور مداحوں کے درمیان سے گزر کر ہوائی میدان جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گئے اور آج بیت اللہ اور ہم سب کے مالک کے حضور کفن میں لپٹے ہوئے اسی دروازے سے برآمد ہوئے، لیکن لوگوں کے کندھوں پر اور گاڑی میں میت رکھ دی گئی۔ دونوں سفر پوری عشق ومحبت کے ساتھ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے اور ہم سب کو صبرِ جمیل کے ساتھ ان کے باغ کی حفاظت کرنے والا بنائے۔

آپؒ کی طبیعت میں سادگی تھی اور اپنے آپ کو چھپاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں جنت میں بھی ان کا ساتھ نصیب فرمائے، آمین! بجاہ سید المرسلین ﷺ!

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

سی جی ایم شوگر کنٹرول سینسر لگے ہونے کی حالت میں وضو، غسل اور نماز کا حکم

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

ایک دوا بنانے والی کمپنی نے شوگر کے مریضوں کے لیے ایک مشین متعارف کروائی ہے، جس کو سینسر کا نام دیا ہے، یہ سینسر بازو میں کہنی کے اوپر اور کندھے کے درمیان والے حصے میں لگایا جاتا ہے، اس کی ترکیبِ استعمال یہ ہوتی ہے کہ ایک پمپ نما چیز کے ذریعے بازو میں لگا دیا جاتا ہے، اس میں ۱ / ۲ پور ہاتھ کی انگلی کے پورے سے کچھ کم ایک سوئی لگی ہوتی ہے، جو اس کو لگاتے ہی جسم میں لگ جاتی ہے۔

تصویر: ۱ میں سینسر کو جسم سے نکلنے کے بعد دکھایا گیا ہے۔ تصویر ۲ سینسر کو لگی ہوئی حالت میں اور تصویر ۳ میں بازو کے اس حصے کو دکھایا گیا ہے سینسر نکالنے کے بعد، اور جس جگہ سوئی چبھی ہے اس حصہ کو دائرہ بنا کر نشان دہی کر دی گئی ہے۔

ترکیبِ استعمال اور فائدہ یہ ہے کہ جب یہ سینسر جسم کے حصے یعنی بازو میں لگا دیا جاتا ہے تو اس کے بعد ۱۴ دن تک شوگر کے مریضوں کو شوگر چیک کرنے کے لیے انگلیوں میں سے خون نکال کر چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ سینسر لگانے کے دو دن بعد سے بالکل وہی رزلٹ دیتا ہے، جیسا کہ عام شوگر ٹیسٹرز دیتے ہیں، البتہ اس کے فوائد میں یہ بات ہے کہ آپ ۲۴ گھنٹے شوگر کی جانچ کر سکتے ہیں، اپنے موبائل فون کو اس سینسر کے قریب لا کر یا پھر اس کے ساتھ آئی ہوئی مشین کو اس کے قریب سے گزار کر، اس میں مریضوں کو سہولت یہ رہتی ہے کہ اگر خدانخواستہ ان کی شوگر تیزی سے نیچے آ رہی

ہوتی ہے، جوکہ کافی خطرناک ہے تو اس پر نظر رکھنا آسان ہوجاتا ہے اور بار بار انگلیوں کو زخمی کرکے خون چیک کرنے کی کوفت اور تکلیف سے بچا جاسکتا ہے، نیز اگر اس سینسر کو کسی وجہ سے ۱۴ دن سے پہلے اتار دیا تو یہ سینسر بے کار ہوجاتا ہے، اور پھر نیا سینسر لگانا پڑتا ہے، اس سینسر کی قیمت تقریباً بارہ ہزار یا اس سے زائد ہے۔

❶ - کیا اس کو پہن کر وضو ہوسکے گا؟ جب کہ وضو والی جگہ پر یہ سینسر نہیں لگا ہوتا، البتہ جسم میں سوئی ایک چبھی ہوتی ہے، سینسر کو جسم سے نکال کر یہ بات بھی جانچ کی گئی ہے کہ خون وہاں سے باہر نہیں آتا۔ تصویر نمبر: ۳ بازو کے اس حصے کی تصویر ہے، جہاں سے سینسر اُتارا گیا ہے، اتارتے وقت اور اس کے بعد بھی خون کا کوئی قطرہ باہر نہیں آیا ہے، اور نہ ہی لگاتے وقت آتا ہے۔

❷ - سینسر لگے ہونے کی حالت میں نماز کا کیا حکم ہوگا؟

❸ - غسل فرض ہونے کی صورت میں شریعت کے مطابق غسل کا کیا حکم ہوگا؟ کیا اس صورت میں سینسر کو اُتارنا لازم ہوگا؟

مستفتی: مولانا ڈاکٹر فرخ

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

❶ - صورتِ مسئولہ میں شوگر سینسر کے لگانے سے اگر خون نہیں نکلتا تو صرف جسم میں سوئی چبھے رہنے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

’’قال في الدر وكذا ينقضهٗ علقة مصّت عضوا وامتلأت من الدم، لأنها لو شقت يخرج منها دمٌ سائلٌ.‘‘ (ج:۱، ص:۲۸۶، ط: سعید)

❷ - سینسر لگے ہونے کی حالت میں نماز ہوجائے گی۔

❸ - سی جی ایم سینسر سے متعلق حاصل کردہ معلومات سے یہ بات واضح ہے کہ سی جی ایم سینسر نہ تو کوئی دوا ہے اور نہ اسے جسم پر لگانا علاج ہے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ شوگر کی کیفیت کا اندازہ ہوتا رہے، جب کہ شوگر معلوم کرنے کا یہی ایک ذریعہ نہیں ہے، اور نہ ہی شوگر کے ہر مریض کو یہ مشین استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ دیگر آلات بھی شوگر جانچنے کے میسر ہیں، اس لیے عمومی حالات میں یہ سینسر لگانا شرعاً حاجت یا ضرورت کے مرتبے تک نہیں پہنچتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ منفعت، فائدہ یا سہولت کے درجے میں ہے۔

دوسری طرف فرض غسل میں سارے جسم پر پانی بہانا فرض ہے، سوئی کے سرے کے برابر بھی جسم کا معمولی سا حصہ دھلنے سے رہ گیا، تو فرض غسل نہیں ہوگا، چناں چہ جسم پر اگر کوئی ایسی چیز لگی ہو جو جسم

کی سطح تک پانی پہنچنے میں رکاوٹ ہو اور اسے جسم سے اتارنے میں حرج بھی نہ ہوتا ہو تو غسل فرض ہونے کی صورت میں اسے جسم سے اُتارنا لازم ہے، ورنہ غسل مکمل نہ ہوگا۔ درِمختار میں ہے:

''یفرض (غسل) کل ما یمکن من البدن بلا حرج.''

(کتاب الطہارۃ، ج:۱،ص:۱۵۲، ط:سعید)

منیہ اور اس کی شرح غنیۃ میں ہے:

''ولو بقي شيئ من بدنه لم يصبه الماء لم يخرج من الجنابة وإن قل أي ولو كان ذٰلك الشيء قليلا بقدر رأس ابرة.'' (منیہ مع غنیۃ،ص:۴۴، ط:رشیدیہ)

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''ولو ألزقت المرأة رأسها بطيب بحيث لا يصل الماء إلٰى أصول الشعر وجب عليها إزالتهٗ ليصل الماء إلٰى أصوله، كذا في السراج الوهاج.''

(الفتاویٰ الہندیۃ، ج:۱،ص:۱۳، ط:سعید)

''الجوهر النيرة'' میں ہے:

''ولو كان على بدنه قشر سمك أو خبز ممضوغ متلبد وجب إزالتهٗ، وكذا الخضاب المتجسد والحناء.'' (الجوهرة النيرة، ج:۱،ص:۱۰، ط:المطبعۃ الخیریۃ)

اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات واضح وثابت ہوجاتی ہے کہ غسل فرض ہونے کی صورت میں سی جی ایم سینسر جسم سے جدا کرکے غسل کرنا فرض ہوگا۔

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
محمد انعام الحق	محمد شفیق عارف	ابراہیم فضل خالق
		دارالافتاء

جامعہ علوم اِسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نَقدُ و نَظَر

’’عباد الرحمٰن‘‘ (اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان)

مولانا نسیم احمد غازی مظاہری۔ صفحات: ۹۵۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۂ اصلاح وتبلیغ، حیدرآباد۔ رابطہ نمبر: 022-2621622

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو پیدا فرما کر آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ کیا ہے، اب وہ اپنے بندوں کو کن صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے اور کن خوبیوں وکمالات سے مزین کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے اس نے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ان ایمانی اوصاف کا ذکر فرمایا ہے، جو آخرت کی تیاری کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ سورۂ فرقان کا آخری رکوع بھی انہی مقامات میں سے اہم ترین مقام ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ان تیرہ اوصاف کو ضروری قرار دیا ہے، جو انسانوں کو ’’رحمٰن کے بندے‘‘ بنا سکتے ہیں۔ زیرِ نظر مختصر کتابچے میں انہی تیرہ اوصاف کی تشریح دلنشین انداز میں کی گئی ہے، اسلوبِ بیان ایسا ہے جو قاری کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور عمل کے میدان میں اُترنے پر مجبور کردیتا ہے۔ اس رسالے کا مطالعہ قارئین کو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی صف میں شامل ہونے کے لیے سبقت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔
اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس حسین کاوش کو قبولیت عند اللہ ومقبولیت عند الناس نصیب فرمائے، آمین!

علم اور اہلِ علم.... (فضائل، ذمہ داریاں)

مولانا حافظ محمد طاہر حافظ بشیر۔ ترجمہ وترتیب: مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی۔ صفحات: ۱۷۶۔ ناشر: مکتبۂ علوی، عثمان آباد، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0335-2102186

مخلوقاتِ عالم میں ہر ایک کو دوسرے پر امتیاز حاصل ہے، مگر انسان کو جس چیز نے تمام مخلوقات سے اشرف ٹھہرایا وہ ’’علم‘‘ ہے۔ قرآن وسنت میں علم واہلِ علم کے فضائل بیان ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں دارِ

ارقم اور مدینہ طیبہ میں صفہ کے چبوترے علم ہی کے ادارے ہیں جو دورِ نبوی میں وجود میں آئے۔ تحصیلِ علم کا یہ سلسلۃ الذہب چودہ صدیوں کا سفر طے کرکے آج اس مقام تک آ پہنچا ہے کہ اب ہر جانب علوم وفنون کے فوارے پھوٹتے ہیں اور تشنہ طلب اس سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ علم اور اہلِ علم کے فضائل و ذمہ داریوں پر تصنیف کردہ زیرِنظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب دراصل ایک عربی کتاب ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ'' کے منتخب مضامین کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب کے مؤلف مولانا حافظ محمد طاہر حافظ بشیر (سعودی عرب) کی خواہش اور جناب انجینئر سید منظور احمد کی تحریک پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے استاذ مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کتاب چودہ فصلوں پر مشتمل ہے، ہر ہر فصل میں علم اور اہلِ علم سے متعلق اہم عنوانات کے تحت آیات واحادیث مع اصل متن وترجمہ جمع کردی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے جامع، مترجم اور ناشر کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اور طلبۂ علومِ دینیہ اور علماء کرام کو اس کتاب کا مطالعہ کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کتاب کے موضوع کی مناسبت سے ہماری رائے ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر عام وخاص کے لیے مفید ہے، بالخصوص علماء اور طلبہ کو اس کا ایک دفعہ ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ آمین!

زیارتِ روضۂ اقدس (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) (مشروعیت، آداب، فضائلِ مدینہ منورہ)

مفتی ابوالخیر عارف محمود۔ صفحات: ۲۴۰۔ ناشر: مدرسہ فاروقیہ، کشروٹ، گلگت۔ ملنے کا پتا: دارالکتاب، یوسف مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ رابطہ نمبر: 0300-8099774

کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب روضۂ اقدس پر حاضری کی شرعی حیثیت اور اس کے آداب وفضائل پر لکھی گئی ہے۔ کتاب کی تالیف کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مؤلفِ کتاب لکھتے ہیں:

''گزشتہ کچھ عرصہ سے سوشل میڈیا کے ذریعے یہ پروپیگنڈا بھی کیا جارہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت ضروری نہیں، نہ ہی یہ ثواب کا کام ہے، بلکہ بعض لوگ تو اس کے لیے سفر کو بھی ناجائز ٹھہراتے ہیں، جب کہ انہی سے متأثر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اصل تو مسجدِ نبوی کی زیارت ہے، اس کی نیت سے سفر کرلیا جائے اور وہاں پہنچ کر ضمنی طور پر روضۂ اقدس کی زیارت کرلی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ کثرت سے زیارت کرنا، ہرنماز کے بعد صلوٰۃ وسلام کے لیے قبر مبارک پر حاضری دینا، دوسروں کی طرف سے سلام عرض کرنا، اور واپسی کے وقت سلامِ وداع کی عادت درست نہیں، اور یہ قابلِ نکیر ہے۔ جب کہ بعض

لوگ اسے ایک اختلافی مسئلہ باور کرواکے اس کی اہمیت گھٹانے کے درپے ہیں اور دلیل کے طور پر علامہ ابن تیمیہ واتباعہ اور معاصر سلفیہ کے منہج کی تقلید میں زیارتِ قبرِ مبارک کے سلسلے میں وارد احادیث وآثار کو موضوع یا ضعیف جداً قرار دے کر عدمِ انشراحِ قلب کی باتیں کرتے ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔‘‘ (ص:۳۲)

چنانچہ مؤلف کتاب نے ان شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کے لیے قلم اٹھایا اور ساتھ ساتھ اہلِ سنت کے موقف کو پوری وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے پہلے اس نفس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ امتِ مسلمہ کے اسلاف واخلاف نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی مشروعیت پر نہ صرف متفق ہیں، بلکہ جمہور علمائے اہلِ سنت نے نبی کریم ﷺ کے روضۂ اقدس کی زیارت کو پسندیدہ سنت، افضل المندوبات اوراوکدالفضائل والمرضیات قرار دیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کو تین ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں: قرآن وسنت کے دلائل، صحابہ کرامؓ وتابعینؒ کے آثار، اجماع، قیاس اور مذاہب اربعہ کا بیان، جمہور فقہاء وشراحِ حدیث کی آرا، کثرتِ زیارت، تبلیغ سلام اور سلامِ وداع کی شرعی حیثیت، اکابر علمائے دیوبند کی آراء، حدیث نبوی: ’’لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْداً‘‘ اور ’’لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ‘‘ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں: شیخ المشائخ حضرت اقدس مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ کی کتاب ’’فضائلِ حج‘‘ سے ’’آدابِ زیارتِ روضۂ اقدس‘‘ مع عنوانات شامل کیے گئے ہیں، اور تیسرا باب: مدینہ طیبہ کے فضائل کی احادیث کے ترجمہ وتشریح پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور قارئین کے لیے اسے راہنمائی کا ذریعہ بنائے۔ آمین